کتاب و سنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد

حیدرآباد

Volume:15 Issue:7 July 2022

مدیر

مولانا محمد عبدالقوی

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

www.iauth.in

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

اشرف الجرائد کی توسیع واشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ



درسِ قرآن

وہ قلب نازک تر از آبگینہ تھا مگر۔۔۔

از: مولانا محمد عبدالقادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝۶

(سورۃ الکہف:6)

ترجمہ: (اے پیغمبر) اگر لوگ (قرآن کی) اس بات پر ایمان نہ لائیں تو ایسا لگتا ہے جیسے تم افسوس کر کر کے ان کے پیچھے اپنی جان کو گھلا بیٹھو گے۔

توضیح: فداہ ابی و امی وجہِ تخلیق وتزئین کائنات حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تاریخ کی مظلوم، ستم رسیدہ، واحد انوکھی ایسی ذاتِ گرامی ہے جس سے امت کو رحم، کرم، عنایت، وفا، دعا ملی اور ان بے نظیر احسانات کے عوض امت کے کچھ شقی القلب اور محروم القسمت لوگوں کی طرف سے اس مشفق ومکرم جود وسخا کے پیکر مجسم کو ایذا، دشنام طرازی، بغض وعناد، طعنہ وتشنیع ملی حالاں کہ هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَان

بس ایک نبوت کا اعلان، دنیاوی واخروی فلاح وکامرانی کا ضامن ایک جملہ زبان مبارک سے کیا نکلنا تھا اب آپ الصادق، الامین نہیں نعوذ باللہ الساحر، الکاھن، الشاعر، المجنون، الابتر ہو گئے، یہ عجیب ستم ظریفی تھی کہ جس کی دہائی دے کر فریاد کی جاتی تھی، جس کے وسیلے سے سیرابی مانگی جاتی تھی، جس کے توسط سے دعائیں قبول کروائی جاتی تھیں، جس کے حسن تدبیر سے آپسی نزاعات کو دور کیا جاتا تھا، جس کا وجود باجود کو باعثِ خیر و برکت سمجھا جاتا تھا، آناً فاناً وہی سب بدعنوانیوں کا مرکز قرار دے دیا گیا۔ **نعوذ باللہ من ذالک**، محروم ہدایت کچھ شرپسند ہر ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں جس سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو، ان کی شناخت کو، ان کے پیغام کو بدنام کیا جائے، مکہ کی سرزمین باوجود وسعتوں کے تنگ ہو چکی تھی، ہر سو افواہوں کا بازار گرم، الزام تراشیاں زخموں پر نمک پاشیاں، پیہم گستاخیاں، پے در پے رسوائیاں، اللہ! اللہ!! اس نازک ترین

* ذمہ دار ادارہ حسیب المدارس

قلب مبارک پر حالات کی ان بجلیوں نے کیا ظلم ڈھایا ہوگا، اس پرچشم فلک نے یہ کشادہ ظرفی بھی دیکھی کہ اسی دکھی زبان مبارک سے قوم کی ہدایت کی دعا، اپنی بے بسی اور کمزوری کی فریاد کے علاوہ کچھ نہ نکلتا تھا، یہ کردار جہاں لائق تحسین ہے وہیں علماء، ودعاۃ کے لیے قابل تقلید اور اپنی محنتوں میں تاثیر کا سبب ہے۔

گستاخ رسول اور گستاخی ان دونوں کا حکم، ان کا انجام خود اللہ نے قرآن میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حکم، اپنے عمل اپنے کردار سے بتلا دیا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنی جانوں پر کھیل کر گستاخوں کو کیفر کردار تک پہنچا کر جہاں عشق و وفا کا ثبوت دیا وہیں قیامت تک آنے والے عشاق کو پیغام بھی دے دیا کہ ہم ہر چیز پر سمجھوتا کر سکتے ہیں مگر نبی کی ناموس اور جاہ وجلال پر کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے، چاہے وہ ابولہب کی ہلاکت ہو، یا ابن خطل کا قتل ہو، یا کعب ابن اشرف کا سر اتارنا ہو، یا اسماء بنت مروان کا صفایا ہو، یا ابو رافع یہودی کو واصل جہنم کرنا ہو، ایسے بے شمار واقعات ہیں۔

زمانۂ نبوت سے ہی نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناموس کے ساتھ شپرہ چشمی چل رہی ہے اور یہ خود آپ کی صداقت وحقانیت کی دلیل ہے الفضل ما شھدت بہ الأعداء اور یہ ستیزہ کاری چلتی رہے گی لیکن۔۔۔۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے دشمن نے تو آپ کے حینِ حیات اذیتیں پہنچائیں اور آپ کے وصال کے بعد بھی پہنچا رہے ہیں اس ایذا رسانی میں ہم بھی کسی قدر حصہ دار بن رہے ہیں، جس نبی نے ہم سے اپنی جان سے زیادہ پیار کیا، ہماری کامیابی و کامرانی کے حریص رہے اور ہماری فلاح و بہبودی کے خاطر اپنے ارمانوں کا خون کیا، اپنی زندگی سے سکون کو ختم کیا، وہ ہمارے لیے دائم الحزن کثیر البکاء تھے، مومنین کی معمولی تکلیف سے بھی ان کے آنسو چھلک پڑتے تھے یہ ادائیں یہ کڑھن، یہ تڑپ ہمارے ہی لیے تھی، ہمارے سچے خونی رشتوں میں بھی یہ نظیر ملنی مشکل ہے مگر ہمارا رویہ اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیا ہے؟ شعبہائے حیات سے ہم نے اپنے نبی کو عملاً دور کیا، کیا کوئی وفا کا بدلہ جفا سے، حسن اخلاق کا صلہ بد اخلاقی سے دیتا ہے؟ یہ ہماری طرف سے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہت بڑا ظلم ہے، ہم ایسے بے راہ ہو کر اپنے نبی کی شفاعت کی کیا امید رکھ سکتے ہیں، ہم تو ان کا سامنا کرنے کے بھی قابل نہیں ہیں، کہیں کل روز محشر ہماری زباں سے بھی یہ جملہ نہ نکلے یٰوَیۡلَتٰی لَیۡتَنِیۡ لَمۡ اَتَّخِذۡ فُلَانًا خَلِیۡلًا حالات ہم کو آگاہ کر رہے ہیں، یہ وقت سنبھلنے، دین سے قریب آنے، آپ کی پیاری سنتوں کو اپنانے کا ہے، ابھی حالات بدتر ہوئے، کہیں دین کے حوالے سے غفلت کو لے کر بدترین نہ ہو جائیں۔ الامان الحفیظ



درس حدیث

قربانی؛ خون بہانے اور گوشت خوری کا نام نہیں

از: مولانا مفتی محمد احمد علی قاسمی*

عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنھا أَنَّ رسولَ اللہ ﷺ قَالَ : مَاعَمِلَ آدَمِيٌّ مِنْ عَمَلٍ يَومَ النَّحْرِ أَحَبَّ إِلَى اللہِ مِنْ اِهْرَاقِ الدَّمِ إِنَّهَا لَتَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرُوْنِهَا وَأَشْعَارِهَا وَ أَظْلَافِهَا وَإِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللہِ بِمَكَانٍ قَبْلَ أَنْ يَقَعَ مِنَ الْأَرْضِ، فَطِيْبُوا بِهَا نَفْساً (رواہ الترمذی: ۱۴۹۳)

ترجمہ: ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قربانی کے دن سب سے زیادہ محبوب عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک خون بہانا ہے، قیامت کے دن قربانی کے جانور اپنے سینگوں، بالوں اور کُھروں کے ساتھ آئیں گے، قربانی کے جانور کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبولیت کا درجہ حاصل کرلیتا ہے، لہذا تم لوگ دل کی خوشی کے ساتھ قربانیاں کیا کرو۔

تشریح: قربانی کیا ہے؟ یہی سوال صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کیا، جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے، جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے راہ خدا میں پیش آنے والے تمام آزمائشوں میں ثابت قدم رہے؛ حتیٰ کہ اپنے لخت جگر نور نظر بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو بھی حکم خداوندی کے مطابق ذبح کرنے پر بہ طیبِ خاطر تیار ہوگئے، اوراسی طرح حکم رب کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرنا یہ مقصد قربانی ہے، پھر صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! پھر اس عمل میں ہمارے لیے کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: قربانی کے جانور کے ہر بال کے بدلہ میں ایک نیکی ہے صحابہؓ نے عرض کیا کہ صوف (یعنی اُون جو بعض جانوروں میں بہت زیادہ رہتے ہیں) کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اُون کے ہر بال کے بدلہ میں بھی ایک نیکی ہے۔ (مشکوٰۃ: ۱۴۷۶)

پیش نظر حدیث مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے قربانی کی عظمت وفضلیت بیان کرتے ہوئے تین باتیں ارشاد فرمائیں، پہلی بات یہ ہے کہ قربانی کے تینوں دنوں میں فرائض وواجبات کے بعد سب سے زیادہ محبوب

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

وپسندیدہ عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربانی ہے؛لہذا ایام النحر میں ہر عمل سے افضل عمل قربانی کرنا ہے؛ دوسری بات یہ ہے کہ جن جانوروں کی دنیا میں قربانی کی جاتی ہے، اُن تمام جانوروں کو اُن کے سینگوں کھالوں اور بالوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنی شانِ قدرت سے روزِ قیامت حاضر کرے گا، جو میزانِ عمل میں تولے جائیں گے، جو انسان کی نجات اخروی وفلاحِ دائمی کا سبب ہوگا؛ تیسری بات یہ ہے کہ قربانی ایسا مبارک وافضل عمل ہے کہ جانور کا خون ابھی زمین پر گرا نہیں اُدھر اللہ تعالیٰ کے پاس قبولیت کا درجہ حاصل کرلیتا ہے، جب قربانی اتنی عظیم برکتوں اور فضیلتوں کو لئے ہوئے ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو اپنی جی کی خوشی کے ساتھ انجام دو، اور یہ مت سمجھو کہ قربانی کرنے میں اتنا پیسہ خرچ ہوجائے گا یا ان پیسوں کو کسی دوسرے خیر کے مصرف میں صرف کریں گے، یا جانوروں کی قلت ہو جائے گی، یا معیشت کی تباہی ہوگی وغیرہ؛ جیسا کہ اس قسم کی باتیں روح شریعت سے ناواقف اور عقل ناقص کے حامل لوگ کیا کرتے ہیں، حدیثِ مذکور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اور ان جیسی ساری خرافات اور و لایعنی خیالات وتصورات کا بہ یک جملہ رد فرمادیا کہ قربانیاں دل کھول کر حسب استطاعت جس قدر ہوسکے کرو؟ کہ یہ صرف خون بہانے اور گوشت کھانے کا نام نہیں ہے؛ بلکہ ایک عظیم الشان عبادت اور تقرب خداوندی ورضاء رب کا ذریعہ ہے۔قربانی کی روح اور اُس کی حقیقت دراصل فنائیت واطاعت شعاری کا وہ جذبہ اپنے اندر پیدا کرنا ہے جو سیدنا حضرت ابراہیمؑ کے واقعاتِ زندگی سے ہم کو ملتا ہے، شیطان انسان کو اپنے نفس اور اُس کی خواہشات کا غلام بنانا چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ انسان کو قربانی کے اس عمل کے ذریعہ نفس وعقل کی غلامی سے نکال کر اپنی بندگی وعبدیت کے مقام پر لانا چاہتے ہیں، جو مراتب قربِ الٰہی میں اہم ترین مقام ہے دور حاضر میں عامۃً لوگوں کا یہ ذہن واحساس بنتا جارہا ہے کہ شریعت اسلامیہ کے احکامات وہدایات پر اُسی وقت عمل پیرا ہونا چاہتے ہیں جب وہ اُن کی اپنی عقل اور فہم کے مطابق ہوں، ورنہ سرے سے انکار یا اعراض پر آمادہ ہوجاتے ہیں، جو یقیناً بہت بڑی گمراہی وضلالت ہے، عبدیت وبندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ بندہ کے سامنے جب جو حکم بھی رب تعالیٰ کا آئے فوراً عمل کے لیے تیار ہوجائے؟ یہی اسلام اور مسلمان ہونے کا مطلب ہے۔

قربانی کے ایام میں قربانی کے عمل میں امت مسلمہ کو بار بار یہ سوچنا چاہیئے کہ اِس عمل کے ذریعہ فنائیت وفدویت کا جذبہ اور احکاماتِ الٰہیہ پر بلا تامل عمل آوری کا شوق ہمارے اندر پیدا ہورہا ہے یا نہیں؟ اگر ہورہا ہے تو یہ خوش آئند اور لائق سعادت بات ہے، اور اگر نہیں تو پھر قربانی کے روح اور اُس کی حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے، ارشادِ باری ہے: لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ

پیش گفتار

قصۂ

سیدنا ابراھیم و اسماعیل علیہما الصلوٰۃ السلام*

از: مدیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ وبہ نستعین

حضرت ابراہیم علیہ السلام آج سے تقریباً چار ہزار سال قبل آزر کے گھر میں پیدا ہوئے۔ یہ زمانہ نمرود کی جابرانہ حکمرانی کا تھا، شرک و کفر عام تھا، لوگ نمرود کے دبدبہ سے متاثر ہوکر اسی کو خدا سمجھ بیٹھے تھے، ستاروں کی تاثیر اور اصنام کی پرستش گھر گھر جاری تھی، قرآن مجید نے ان کے والد کا نام ''آزر'' قرار دیا ہے۔ اور آزر کے معنی علماء نے ''عاشق صنم'' بتلائے ہیں۔ اسی سے ان کے والدین اور خاندان کا مزاج معلوم ہوجاتا ہے کہ کیسا مشرکانہ رہا ہوگا؛ تاہم حضرت ابراہیم علیہ السلام بچپن ہی سے مُوَحِّدانہ مزاج کے حامل، اور بڑی خوبیوں کے مالک تھے، اللہ پاک کو چونکہ ان سے بہت کام لینا تھا اور انہیں ''انسانیت کا امام'' بنانا تھا، اس لئے وہ کڑی آزمائشوں سے گزارے گئے۔ ان کی آزمائشوں اور راہ خدا میں ابتلائات کی بھی لمبی فہرست ہے، یہاں ان کا احاطہ مشکل ہے۔ انہیں آزمائشوں میں سے ایک آزمائش یہ واقعہ ہے جو ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے متعلق ہے۔ عنوان کی مناسبت سے یہاں مختصر درج کیا جارہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بڑی اہلیہ حضرت سارہ علیہا السلام تھیں؛ لیکن چھیاسی برس کی عمر تک بھی ان سے اولاد نہیں ہوئی، ادھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اولاد کی چاہت بھی تھی، ضرورت بھی، اس لئے وہ دعا فرمایا کرتے تھے رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴿۱۰۰﴾ یعنی ''اے اللہ! مجھے نیک اولاد عطا فرما'' ان کی اہلیہ حضرت سارہ علیہا السلام نے ان کی اس خواہش اور تمنا کو دیکھ کر اور اپنے ذریعہ سے اولاد ہونے کی امید سے مایوس ہوکر

---

* یہ مضمون مدیر محترم کے رسالے ''احکام قربانی و عقیقہ'' سے ماخوذ ہے۔

عرض کیا کہ ''اللہ تعالیٰ نے مجھے اولاد سے محروم رکھا، یہ میری خادمہ ہاجرہ (علیہ السلام) ہے، یہ میں آپ کو ہبہ کئے دیتی ہوں، ممکن ہے اللہ پاک اس کے ذریعہ آپ کو اولاد عطا فرمادیں''۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے نکاح فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے ذریعہ آپ کو اولاد عطا فرمائی، آپ نے اپنے اس بیٹے کا نام ''اسماعیل'' رکھا۔ ابھی یہ لڑکا شیر خوار ہی تھا کہ اللہ رب العزت نے انہیں مکہ مکرمہ کی بے آب و گیاہ سرزمین پر (جہاں کوئی متنفس بھی نہیں رہتا تھا) اس لڑکے کو اور ان کی والدہ کو چھوڑ آنے کا حکم دیدیا۔ حسبِ ہدایت آپ انہیں لے کر وہاں پہونچے، ساتھ میں ایک جھولی میں کچھ کھجوریں اور ایک مشکیزہ میں پانی رکھ دیا۔ کیونکہ اس علاقہ میں نہ کوئی درخت تھا اور نہ ہی پانی کا دور دور تک کہیں پتہ، جب آپ لوٹنے لگے تو سیدہ ہاجرہ علیہا السلام نے عرض کیا کہ آپ مجھے اور اس معصوم کو اس بے آب و گیاہ میدان میں جہاں نہ کوئی مونس ہے نہ غمخوار کیسے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ـــــ اس خوف سے کہ کہیں ان کی محبت تعمیل حکم میں رکاوٹ نہ بن جائے ـــــ ان کی جانب بالکل التفات نہ فرمایا۔ یہاں تک کہ حضرت ہاجرہؓ نے خود پوچھا کیا اللہ پاک کا حکم ہے؟ فرمایا ہاں! عرض کرنے لگیں تب تو آپ بے فکر رہیں، مجھے بھی اطمینان ہوگیا اللہ پاک ہمیں ضائع نہ فرمائے گا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام واپس ہوگئے۔ سیدہ ہاجرہ علیہا السلام اپنے معصوم اسماعیل کو دیکھ دیکھ کر زندگی گزارتی اور کھجوروں اور پانی سے بھوک و پیاس مٹاتی رہیں۔ یہ تھوڑے سے کھجور اور مختصر سا پانی کب تک کام دیتے ایک روز ختم ہوگئے، اور آپ بہت پریشان ہوگئیں، اپنے سے زیادہ بچے کا اضطراب آپ کو بے چین کئے رہا، دور دور تک پانی کا کہیں اتہ پتہ نہ تھا، آپ سے رہا نہ گیا اور بچہ کو ریت پر ڈال کر پانی کی تلاش میں نکل گئیں۔ قریب میں صفا پہاڑی تھی اور اس کے متصل مروہ۔ آپ دونوں پر چڑھ جاتیں اور دیکھتیں کہ وادی میں کوئی نظر آجائے مگر کسی کو نہ پاتیں تو اتر آتیں، درمیانی نشیبی علاقے سے گزرتیں تو اپنا ایک بازو اٹھا کر تیز گام ہوجاتیں تاکہ جلدی سے بلندی تک پہونچ جاویں، اور دیکھیں کوئی مددگار اور غم گسار نظر آجائے، مگر کسی کو نہ پاتیں، اسی طرح آپ نے سات چکر لگائے اتنے میں کسی پکارنے والے کی آواز سنی وہ آپ کو متوجہ کررہا تھا۔ یہ ایک فرشتہ تھا جو اُس جگہ کھڑا تھا جہاں اب ''بئر زم زم'' ہے۔ اس نے اپنے پیر یا پر سے زمین پر ٹھوکر ماری جس کے ساتھ ہی زمین سے پانی اُبلنے لگا، سیدہ ہاجرہؓ جلدی جلدی اس کے اطراف ریت کی منڈیر بنانے لگیں اور کہنے لگیں ''زم زم''، یعنی تھم جا تھم جا۔ چنانچہ وہ پانی رُک گیا۔ آپ نے چُلو سے خود پیا اور اپنے بچے کو پلایا۔ اس طرح

تکوینی طور پر تسکین کا سامان ہوا، ادھر یہ فرشتہ نے یہ طمانیت بھی دی کہ آپ گھبرائیں نہیں۔ اللہ پاک آپ لوگوں کو ضائع نہیں فرمائے گا۔ یہاں قریب ہی میں ''بیت اللہ'' ہے۔ جس کی تعمیر جدید آپ کے اس بچے اور اس کے محترم والد ہی کو کرنی ہے، اب آپ اطمینان اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کرتی رہیں۔

جزیرۃ العرب میں خصوصاً اُس زمانہ میں پانی نادرالوجود تھا۔ لوگوں کو کسی جگہ پانی کا پتہ چلتا تو اُسی جگہ کو اپنی بستی بنالیتے تھے، قبیلہ بنو جرہم کا ایک قافلہ وادی مکہ کے قریب سے گزر رہا تھا، ان لوگوں نے پرندوں کو پرواز کرتے دیکھا تو کہنے لگے کہ قریب میں کہیں پانی ضرور ہوگا، تب ہی تو یہ پرندے اس طرف نظر آرہے ہیں، چنانچہ چند آدمیوں کو تحقیق کے لئے بھیجا، ان لوگوں نے زم زم کو دریافت کرلیا، اس قافلہ نے حضرت ہاجرہ علیہا السلام سے وہاں قیام کرنے کی اجازت چاہی، آپ کو تنہائی سے وحشت ہو ہی رہی تھی، آپ نے انہیں بخوشی اجازت دیدی، لیکن یہ شرط رکھی کہ اس پانی پر تمہارا حق ملکیت کچھ نہ ہوگا۔ بس استفادہ کرسکتے ہیں، وہ لوگ راضی ہوگئے، اور اپنے بقیہ خاندان کو بھی لاکر یہیں آباد کرلیا، حضرت اسماعیل علیہ السلام اسی قبیلہ کے بچوں کے ساتھ کھیلتے اور انہیں سے زبان عرب سیکھا کرتے تھے، آگے چل کر اسی خاندان میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نکاح بھی ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب جب آکر ان لوگوں کی دیکھ بھال فرمالیا کرتے تھے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام جب ذرا ہوشیار ہوئے —— عمر کتنی تھی اس میں اختلاف ہے —— تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا جس کا حاصل یہ تھا کہ انہیں اپنے بچے کو ذبح کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی الٰہی کی ایک صورت ہے، اور واجب العمل ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیل حکم کا ارادہ فرمالیا اور اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے لئے فرمایا بیٹا! میں خواب میں کیا دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں، تم بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے؟ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ صالح بیٹے نے فوراً عرض کیا: ابا جان! آپ کو جو حکم ملا ہے اسے کر گزرئے، اور جہاں تک میرا معاملہ ہے تو انشاء اللہ مجھے آپ صابرین میں سے پائیں گے۔ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۰۲ سعادت مند بیٹے کے اس سعادت مندانہ اور مطیعانہ جواب کو سنا تو انہیں لے کر منیٰ کی وادی میں تشریف لے گئے اور اُس جگہ جسے اب ''منحر'' کہا جاتا ہے بیٹے کو زمین پر کنپٹی کے بل لٹادیا جیسے جانوروں کو ذبح کے لئے لٹادیا جاتا ہے، پھر چھری نکال کر ذبح کرنے کا ارادہ فرمایا مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کو بس آزمائش مقصود تھی اور وہ ہوچکی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے چھری

کواسماعیل علیہ السلام کا گلا کاٹنے سے روک دیا، اور ارشاد فرمایا: يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ ’’اے ابراہیم! تم نے خواب سچ کر دکھایا‘‘ یعنی تعمیل حکم کردی، ہمارا مقصد تم سے بیٹے کو ذبح کروانا نہیں تھا، بلکہ تمہارے جذبہ ایثار وقربانی کا مشاہدہ کرنا تھا۔ سو وہ ہو چکا، اب تمہیں یہ دُنبہ دیا جارہا ہے، اس کو اسماعیل (علیہ السلام) کے بدلے میں ذبح کردو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پلٹ کر دیکھا تو ایک سفید رنگ کا فربہ خوبصورت بکرا موجو تھا، آپ نے اسے ذبح فرمادیا، حق تعالیٰ نے فرمایا ’’اب ہم اس رسم ایثار وقربانی کو قیامت تک کے لئے جاری کئے دیتے ہیں، اور تم پر سلامتی اتارتے ہیں‘‘۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۱۰۹﴾ ’’نیز ہم ہر مطیع وفرمانبردار اور نیکوکار بندے کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں‘‘۔ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

(البدایہ والنہایہ: ۱/ ۱۴۵-۱۴۴ مختصراً۔ یہ پورا واقعہ اسی کتاب سے ماخوذ ہے)

چنانچہ اُس زمانہ سے آج تک ان کی ملت ایام تشریق میں خوب ذوق وشوق کے ساتھ اس رسم قربانی کو انجام دیتی چلی آرہی ہے۔

دعوتِ فکر وعمل

قربانی کی حقیقت وروح یار کی خاطر اغیار سے قلب کو پاک کرلینا اور اپنی جان ومال، اولاد، خواہشات تمام چیزوں کو آقا ومالک کی مرضیات کے تابع بنالینا ہے، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس عظیم قربانی کے تاریخی پس منظر کے موقع پر جہاں ہم جانوروں کا خون بہا کر بارگاہ رب العزت میں اپنی وفاداری وجاں نثاری کا نمونہ پیش کرتے ہیں، آیئے ہم اسی موقع پر حق تعالیٰ سے تمام بدعات وخرافات اور ایسے رسم ورواج (جو غیر شرعی ہونے کے علاوہ سماج کے لئے وبال بھی ثابت ہو چکے ہیں) کی قربانی کا وعدہ کریں، اور یہ کہ پوری زندگی قرآن وسنت کے موافق گزارنے کے لئے کسی بھی طرح کی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہ کریں گے اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین

گوشۂ سیرت

با محمد ہوشیار!

از: مرتب*

امام قرطبیؒ نے حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ مکہ میں جمیل بن معمر نامی ایک مشرک تھا، نہایت ذہین اور دانا تھا جو بات سنتا وہ اس کے حافظہ میں محفوظ ہو جاتی تھی، قریش کا اس کے بارے میں خیال تھا کہ ''اُسے یہ ساری باتیں اس لئے یاد ہو جاتی ہیں کہ اس کے دو دل ہیں''، بل کہ وہ بھی کہتا تھا کہ میرے دو دل ہیں دونوں بہت عقل والے ہیں، ان میں سے ہر ایک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عقل بہتر ہے (نعوذ باللہ من هفواته) (اس گستاخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ) جب جنگ بدر ہوئی اور مشرکین کو حق تعالیٰ نے شکست سے دوچار کیا تو یہ ابو معمر جمیل بن معمر بھی شکست کھایا، ابوسفیان اس سے ملے دیکھا کہ وہ اپنی ایک چپل ہاتھ میں پہنے ہوئے ہے اور دوسری ایک پاؤں میں، تو پوچھا:۔ ابو معمر لوگوں کا کیا حال ہے؟ ابو معمر نے کہا: لوگ جنگ ہار گئے۔

ابوسفیان نے پوچھا: اور تمہارا کیا حال ہے کہ ایک چپل ہاتھ میں ایک چپل پاؤں میں پہنے ہوئے ہو؟

اس نے (حیرت سے) کہا: ''مجھے محسوس ہی نہیں ہوا، میں تو اس خیال میں ہوں کہ دونوں چپل پاؤں میں پہنے ہوئے ہوں!'' تب قریش کے لوگوں سمجھ میں آیا کہ اگر اس کے سینے میں دو دل ہوتے تو ہاتھ میں چپل ہونے کو نہ بھولتا، اور ایسی پاگل پن کی حرکت نہ کرتا۔ (حاشیۃ الصاوی: ۵/ ۲۵)

فائدہ: غور کرنے کی بات ہے کہ اللہ پاک اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والوں کو کس طرح اپنوں ہی میں ذلیل و رسوا کرتے ہیں، خود کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ عقل مند بتانے والا بے وقوفوں اور پاگلوں کی حرکات سے بھی زیادہ گری ہوئی حرکت کر بیٹھا، تاریخ کے صفحات پلٹائیں تو سارے ہی گستاخوں کا دنیا میں یہ انجام بدنظر آئے گا، اور آخرت کا دردناک عذاب تو ان کے لئے تیار رہے ہی۔ کسی نے سچ کہا ع

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار!

صلی اللہ النبی الکریم و علی اٰلہ و اصحابہ اجمعین

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

گوشۂ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا

از: مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی*

نام ونسب: نام معلوم نہیں، ام رومان کنیت ہے، قبیلہ کنانہ کے خاندان فراس سے تھیں، سلسلہ نسب یہ ہے، ام رومان بنت عامر بن عویمر بن عبد شمس بن عتاب بن اذینہ بن سبیع ابن وہمان بن حارث بن غنم بن مالک بن کنانہ۔(الاصابة فی معرفة الصحابة:۳۹۱/۸، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

حضرت ام رومانؓ کا شمار بڑی جلیل القدر صحابیات میں ہوتا ہے۔

نکاح: عبداللہ بن حارث بن سنجرہ سے نکاح ہوا اور ان ہی کے ہمراہ مکہ آکر اقامت پذیر ہوئیں، عبداللہ بن حارث حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حلیف بن گئے تھے، عبداللہ کے صلب سے ان کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام طفیل رکھا گیا، عبداللہ بن حارث نے وفات پائی، تو اس کے چند ماہ بعد حضرت ابوبکرؓ نے ان سے خود نکاح کرلیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صلب سے ام رومان کے یہاں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر پیدا ہوئے جو تاریخ اسلام میں نمایاں اور ممتاز ہستیاں ہیں۔

(طبقات ابن سعد:۲۷۶/۸، دار صادر، بیروت)

اسلام: کچھ زمانے کے بعد مکہ سے اسلام کی صدا بلند ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ انہوں نے بھی اس صدا پر لبیک کہا اور بلا تامل صرف ان کی تقلید واتباع میں حلقہ بگوش اسلام ہوگئیں اور اس طرح سابقون اولون کی مقدس جماعت میں شامل ہوگئیں۔

ہجرت: ہجرت کے وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں مدینہ کو روانہ ہوگئے تھے، لیکن ان کا خاندان مکہ میں مقیم تھا، مدینہ پہنچے تو وہاں سے زید بن حارثہؓ اور ابو رافعؓ مستورات کو لانے کے لئے بھیجے گئے، ام رومان بھی ان ہی کے ہمراہ حضرت اسماء اور عائشہ اور حضرت عبداللہ بن ابی بکر کی

* ادارہ علم وعرفان، حیدرآباد، واستاذ حدیث دار العلوم دیودرگ

معیت میں مدینہ آئیں، اور مدینہ آکر اپنے اہل وعیال سمیت میں محلہ بنو حارث بن خزرج میں مقیم ہوگئیں جہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک مکان پہلے ہی سے لے رکھا تھا۔ (الاصابۃ فی معرفۃ الصحابۃ: ۸/۳۹۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

واقعہ افک:

شعبان ۶ ہجری میں افک کا واقعہ پیش آیا، ام رومانؓ کے لئے یہ نہایت مصیبت کا وقت تھا، حضرت عائشہؓ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت لے کر میکہ آئیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بالا خانہ پر تھے اور ام رومان نیچے بیٹھی تھیں، پوچھا: کیسے آئیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سارا واقعہ بیان کیا، بولیں: ''بیٹی! اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں، جو عورت اپنے خاوند کو زیادہ محبوب ہوتی ہے، اس کے سوتنیں حسد کی وجہ سے ایسا کرتی ہیں'' لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس سے کچھ تسکین نہ ہوئی اور چیخ مار کر رو پڑیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آواز سنی تو بالا خانہ سے اتر آئے اور خود بھی رونے لگے، پھر ان سے کہا کہ تم اپنے گھر واپس جاؤ، ان کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ام رومان کو لے کر خود بھی روانہ ہوئے، حضرت عائشہؓ کو چوں کہ اس صدمہ سے بخار آ گیا تھا، دونوں نے ان کو گود میں لٹایا، عصر پڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: ''عائشہ! اگر واقعی تم سے ایسی غلطی ہوئی تو خدا سے توبہ کرو'' حضرت عائشہؓ نے والدین سے کہا کہ آپ لوگ جواب دیں، لیکن جواب ملا کہ ہم کیا کہہ سکتے ہیں، غرض حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خود جواب دیا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہوئی جس میں ان کے صاف طور پر براءت کی گئی تھی، تو حضرت ام رومان بولیں کہ ''تم اٹھ کر حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جاؤ'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''میں ان کی مشکور ہوں اور نہ آپ کی، میں صرف اپنے خدا کا شکریہ ادا کرتی ہو'' لا و الله، لا أقوم إليه، و لا أحمد إلا الله''

(صحیح البخاری، باب تعدیل النساء بعضھن بعضا: حدیث: ۲۶۶۱)

اسی سن کے اخیر میں مہمانوں کا واقعہ پیش آیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہا اصحاب صفہ میں سے ۳ صاحبوں کو اپنے گھر لائے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گئے تو واپسی میں دیر ہوگئی گھر آئے تو ام رومان نے کہا: مہمانوں کو چھوڑ کر کہاں بیٹھ رہے؟ بولے تم نے کھانا نہیں کھایا؟ جواب ملا، کھانا بھیجا تھا، لیکن ان لوگوں نے انکار کر دیا، غرض کھانا کھلایا گیا اور اس قدر برکت ہوئی کہ نہایت افراط کے ساتھ بچ گیا تھا، حضرت ابوبکرؓ نے حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا سے پوچھا: اب کتنا ہے؟ بولیں: تین گنے سے زیادہ، چنانچہ سب اٹھوا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیا گیا'' ثم حملها إلى النبی ﷺ''

(صحیح البخاری، باب السمر مع الضیف والأہل، حدیث: ۶۰۲)

فضائل ومناقب

نہایت عظیم، بابرکت خاتون تھیں، قبول اسلام کے حوالے سے سابقون اولون میں شمار ہوتی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا کی فضلیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''من سرہ أن ینظر إلی امرأۃ مع الحور العین فلینظر إلی أم رومان'' (اسد الغابۃ: ۳۲۰/۷، دار الکتب العلمیۃ بیروت) (جو شخص عورتوں میں حورعین کو دیکھنا چاہے وہ ام رومان کو دیکھے) سید الکونین، فخر موجودات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ام رومان کو جنت کی حور قرار دیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوش دامن اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی والدہ محترمہ ہیں۔

وفات:

حضرت ام رومانؓ کے سن وفات کے بارے میں مؤرخین میں شدید اختلاف ہے، کسی نے ۴ سن ہجری لکھا ہے، کسی نے ۵ سن ہجری اور بعض نے ۶ھ اور ۹ھ بیان کیا ہے، لیکن یہ سن ۹ ہجری کے سلسلے میں نہایت قوی دلائل ہیں، لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے تاریخ صغیر میں حضرت ام رومان کا نام ان لوگوں میں لکھا ہے جنہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں وفات پائی، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ''سیرت عائشہؓ'' میں لکھا ہے کہ حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت تک باحیات رہیں، لیکن جمہور اہل سیر نے سن ۹ ھجری والی روایت کو ترجیح دی ہے، ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی قبر میں اترے ''ونزل رسول اللہ ﷺ فی قبرھا''۔ (طبقات ابن سعد: ۲۷۶/۸، دار صادر، بیروت)

شوہر سے بات کرنے کے آداب

۱) شوہر کو ہمیشہ ادب سے پکارے، تو سے مخاطب نہ کرے آپ کا لفظ استعمال کرے۔

۲) شوہر کی بات پوری توجہ سے سُنے، درمیان میں نہ بولے جب بات پوری ہوجائے اور کوئی بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو پوچھ لے۔

۳) شوہر سے نرم لہجہ میں بات کرے تیز لہجہ میں بات کرنا سخت بے ادبی ہے۔

۴) شوہر کو حکم کے لہجے میں کوئی بات نہ کہے بلکہ یوں کہے کہ آپ فلاں چیز لاسکیں تو مہربانی ہوگی۔

۵) شوہر کو نام لے کر پکارنا بے ادبی ہے۔

(ماخوذ از: آج کا سبق ص: ۲۲۹)

تذکارِ صحابہؓ

فقیہ الاُمۃ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی قاسمی*

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا شمار اُن عظیم المرتبت اور جلیل القدر صحابہؓ میں ہوتا ہے جو بعثت نبوی کے ابتدائی دور میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور بہ حکم رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حبشہ کی جانب دومرتبہ ہجرت فرمائی، پھر مدینہ طیبہ تشریف لائے۔آپؓ قرآن، حدیث اور فقہ تینوں علوم پر غیر معمولی بصیرت و دست رس رکھتے تھے، اکابر صحابہ بیشتر علمی مسائل میں آپ ہی سے رجوع کرتے تھے، بالخصوص فقہ واجتہاد میں یہ امتیازی شان آپ کو حاصل تھی کہ خلفائے اربعہ کے بعد پانچواں نام آپؓ ہی کا لیا جاتا تھا۔آپ کی عظمتِ شان کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کو بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں قربِ خاص حاصل تھا، صاحب الوسادۃ والنعلین کے لقب سے معروف تھے، بعض صحابہ آپؓ کو رازدارِ رسول کے لقب سے بھی یاد فرماتے تھے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ: ہم لوگ جب یمن سے مدینہ آئے تو ایک زمانے تک ابنِ مسعودؓ کو اہلِ بیت نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرد سمجھتے رہے؛ اِس لیے کہ اِس کثرت سے اُن کی اور اُن کی والدہ کی آمد ورفت حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے گھر رہتی تھی جس طرح گھر کے آدمیوں کی ہوتی ہے۔(مسلم شریف)

خود حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجھ سے فرمایا: تیرے لیے میرے یہاں آنے کی اجازت کی علامت یہی ہے کہ پردہ اٹھادیا جائے اور تجھے میری راز ونیاز کی باتیں بھی سننے کی اجازت ہے یہاں تک کہ میں خود منع کردوں۔آپؓ سفر وحضر میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ رہتے، خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم غسل کرنے کا ارادہ فرماتے تو فوراً آپ کے لیے پردہ کا اہتمام کرتے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سو رہے ہوتے تو وقت مقرر پر آپ کو بیدار کرتے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم چلنے کا ارادہ فرماتے تو فوراً نعلین شریفین آپ کے قدموں میں لا رکھتے اور عصا (چھڑی) لے کر آپ کے آگے آگے چلتے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے مسواک اور وضو کے پانی کا انتظام فرماتے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تکیہ کی حفاظت کرتے اور اُسے سوتے وقت خدمت میں پیش فرماتے۔

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

سوانحی نقوش:

آپ ؓ کا نام نامی: عبداللہ، کنیت ابوعبدالرحمن اور والد کا نام مسعود ہے۔ سلسلۂ نسب اس طرح ہے: ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مسعود بن غافل بن حبیب بن شمخ بن فار بن مخزوم بن صاہلہ بن کاہل بن حارث بن تمیم بن سعد بن ہذیل بن مدرکہ بن الیاس بن مضر۔ آپ کے والد مسعود بن حارث زمانۂ جاہلیت ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ والدہ کا نام ''اُمِّ عبد'' تھا، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کو اُن کی والدہ کی نسبت سے ''ابنِ اُمِّ عبد'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

سراپا: آپ ؓ کا جسم چھریرا، قد پست، رنگت تیز گندمی اور ٹانگیں دُبلی پتلی تھیں۔ لمبے بال تھے، جو کانوں کی لوؤں تک آتے تھے۔ عموماً سفید لباس زیب تن کرتے، خوش بُو کے بے حد شوقین تھے، رات کے اندھیرے میں بھی اپنی مخصوص مہک کی بنا پر پہچان لیے جاتے۔ اپنی عام زندگی اور وضع قطع میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تقلید کرتے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

واقعۂ اسلام:

آپ ''السابقون الاولون'' میں سے تھے اور ایک روایت کے مطابق چھٹے نمبر پر اسلام قبول کیا تھا۔ اسلام لانے کی سرگذشت خود اپنی زبانی یوں بیان کرتے ہیں کہ'' میں عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چرایا کرتا تھا، ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر ؓ میرے پاس تشریف لائے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آگے بڑھ کر فرمایا اے فرزند! کیا ان بکریوں کا دودھ ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں! مگر آپ کو دودھ نہیں دے سکتا، کیوں کہ یہ میری نہیں، دوسرے کی امانت ہیں، پھر آپ نے فرمایا: کوئی ایسی بکری بتاؤ جو ابھی چھوٹی ہو اور دودھ نہیں دیتی ہو، میں نے آگے بڑھ کر ایسی بکری پیش کر دی، آپ آگے بڑھے اور اس بکری کی ٹانگ پکڑی اور اس کے تھن کو ہاتھ لگایا اور ساتھ ہی ساتھ کچھ دعائیں پڑھیں، تھوڑی دیر میں بکری کے تھن میں دودھ اتر آیا، جلدی سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک پیالہ نما پتھر لے آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دودھ سے بھر لیا، دونوں بزرگوں نے پیا اور مجھے بھی پلایا، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تھن کو سکڑ جانے کا حکم دیا، تو وہ فوراً سکڑ کر اپنی اصلی حالت میں لوٹ آیا، میں یہ سارا منظر دیکھ کر آگے بڑھا اور عرض کیا، براہِ کرم مجھے بھی آپ یہ بابرکت کلام سکھا دیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے فرمایا: ''إنک غُلیمٌ مُعلَم''، تم تعلیم یافتہ لڑکے ہو۔ (معجم کبیر طبرانی)

اور دوسری روایت میں یہ اضافہ ہے کہ میں نے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ مجھے کچھ قرآن کریم کا حصہ سکھا

دیجیئے تو آپ نے فرمایا تم تعلیم یافتہ لڑکے ہو، پھر میں نے آپ ﷺ کی زبان مبارک سے ستر سورتیں یاد کیں۔ ان روایتوں میں آپ کے اسلام قبول کرنے کی صراحت نہیں ہے، البتہ علامہ ذہبیؒ نے ''مسندِ احمد'' کے حوالے سے لکھا ہے، حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: آپ ﷺ کے اس معجزہ کو دیکھنے کے بعد میں خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا۔

فضائل ومناقب:

1۔ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی مجلس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا تذکرہ ہوا تو انہوں نے کہا: عبداللہ بن مسعود ایسے شخص ہیں جن سے میں محبت کرتا ہوں، اُس وقت سے جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا کہ قرآن چار آدمیوں سے پڑھو! عبداللہ بن مسعود سے (پہلے آپ کا نام لیا) اور معاذ بن جبلؓ سے اور ابی بن کعبؓ سے اور سالمؓ سے جو ابو حذیفہؓ کے غلام ہیں۔ (صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ)

2۔حضرت مسروق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ کہتے تھے: قسم پروردگار کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں قرآن شریف کی کوئی سورت ایسی نہیں اتری جس کی نسبت میں یہ نہ جانتا ہوں کہ وہ کہاں اتری (مکہ میں یا مدینہ میں یا راستے میں) اور قرآن کی کوئی سورت ایسی نہیں اتری جس کی نسبت میں یہ نہ جانتا ہوں کہ وہ (کس باب میں) کس شخص کے حق میں اتری۔ اگر مجھ کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب مجھ سے زیادہ کوئی جاننے والا ہے اور اونٹ وہاں تک جا سکتے ہوں تو میں فوراً سوار ہو کر (علم حاصل کرنے کے لیے) اس کے پاس جاؤں گا۔ (صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ)

3۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ایک بار رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود کو پیلو کے درخت پر چڑھ کر اس کی مسواک اتارنے کو کہا۔ اس درمیان تیز ہوا سے ان کی ٹانگوں سے کپڑا ہٹ گیا (جب کہ وہ انہیں چھپانے کا اہتمام کرتے تھے) لوگ ان کی سوکھی پنڈلیاں دیکھ کر ہنسنے لگے۔ آپ ﷺ نے پوچھا، تمھیں کس بات پر ہنسی آ رہی ہے؟ جواب دیا، تپلی اور کمزور ٹانگیں دیکھ کر۔ فرمایا: میزان عمل میں یہ احد پہاڑ سے زیادہ وزن کی حامل ہوں گی۔ (تاریخ دمشق)

4۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن نبی اکرم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ذرا قرآن کریم پڑھ کر مجھ کو سناؤ، میں نے عرض کیا: بھلا آپ کو کیا سناؤں، قرآن مجید تو آپ ہی پر اترا ہے؟ آپ سے بہتر کون پڑھ سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں! مجھ کو دوسرے سے سننے میں اچھا لگتا ہے، تب میں نے سورۂ نساء کی آیتیں پڑھنا شروع کیں، جب میں اس آیت پر پہنچا: ''فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍۭ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ

عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ شَهِیۡدًا ‘‘ ترجمہ: اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ ہم ہر ہر امت میں سے ایک ایک گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ کو ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے لاویں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کو سن کر فرمایا: بس کرو، اس وقت میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کی آنکھیں اشک بار ہیں۔ (الاستیعاب لابن عبدالبر)

5۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: (ترجمہ) جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، ان پر اس چیز میں کوئی گناہ نہیں ہے جو انھوں نے پرہیزگاری کے ساتھ کھایا، (تا ختم آیت) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ تم ان لوگوں میں سے ہو۔ (صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ)

جذبہ ایمانی کی ایک جھلک:

جیسا کہ عرض کیا گیا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس زمانے میں ایمان لائے، جبکہ مومنین کی جماعت صرف چند اصحاب پر مشتمل تھی اور مکہ کی سرزمین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا اور کسی نے اعلانیہ بلند آہنگی کے ساتھ تلاوتِ قرآن کی جرأت نہیں کی تھی، چنانچہ ایک روز مسلمانوں نے باہم مجتمع ہو کر اس مسئلہ پر گفتگو کی اور سب نے بالاتفاق کہا: خدا کی قسم! قریش نے اب تک بلند آواز سے قرآن پڑھتے ہوئے نہیں سنا، کون ہے جو اس کی ہمت کر سکتا ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو پیش کیا، لوگوں نے کہا کہ تمہارا خطرے میں پڑنا مناسب نہیں، اس کام کے لیے تو ایسا شخص درکار ہے جس کا خاندان وسیع ہو، اور وہ اس کی حمایت میں مشرکین کے دستِ ستم سے محفوظ رہے؛ لیکن حضرت عبداللہؓ نے جوشِ ایمان سے برانگیختہ ہو کر کہا: مجھے چھوڑ دو! خدا میرا محافظ ہے۔

غرض دوسرے روز چاشت کے وقت جب کہ تمام مشرکین قریش اپنی انجمن میں حاضر تھے، اس وارفتۂ اسلام نے ایک طرف کھڑے ہو کر سازِ توحید پر مضراب لگائی اور بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے بعد الرحمٰن عَلَّمَ الۡقُرۡآن کا سحر آفریں راگ چھیڑا، مشرکین نے تعجب اور غور سے سن کر پوچھا: ابن ام عبد کیا کہہ رہا ہے؟'' کسی نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو کتاب اتری ہے اس کو پڑھتا ہے، یہ سننا تھا کہ تمام مجمع غیظ وغضب سے مشتعل ہو کر ٹوٹ پڑا اور اس قدر مارا کہ چہرے پر ورم آ گیا، لیکن جس طرح پانی کے چند چھینٹے آگ کو اور زیادہ مشتعل کر دیتے ہیں، اسی طرح حضرت عبداللہؓ کا شعلۂ ایمان اس ظلم وتعدی سے بھڑک اٹھا مشرکین مارتے گئے؛ لیکن ان کی زبان بند نہ ہوئی۔ حضرت عبداللہؓ جب اس فرض کو انجام دے کر خستگی وشکستہ حالی کے ساتھ اپنے احباب میں واپس آئے تو لوگوں نے کہا کہ ہم اس ڈر سے تم کو جانے نہ دیتے تھے، فرمانے لگے: ''خدا کی قسم!

دشمنانِ خدا آج سے زیادہ میری نظر میں کبھی ذلیل نہ تھے، اگر تم چاہو تو کل میں پھر اسی طرح ان کے مجمع میں جا کر قرآن کریم کی تلاوت کروں‘‘۔ لوگوں نے کہا: بس جانے دو، اس قدر کافی ہے کہ جس کا سننا وہ ناپسند کرتے تھے اس کو تم نے بلند آہنگی کے ساتھ ان کے کانوں تک پہنچا دیا۔ (ملخص از: رُواۃ بخاری کا دل نشیں تذکرہ)

غزوات میں شرکت:

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ تمام مشہور و اہم جنگوں میں جاں بازی و پامردی کے ساتھ سرگرم پیکار رہے، غزوۂ بدر میں دو انصاری نو جوانوں نے سرخیل کفار ابو جہل بن ہشام کو تہ تیغ کیا تھا؛ مگر وہ جاں کنی کے عالم میں تھا، اس درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ’’کوئی جا کر ابو جہل کی خبر لائے۔‘‘ اس پر صحابہؓ اُس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اتنے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی نظر لاشوں کے درمیان ابو جہل پر پڑی، جو قریب المرگ تھا۔ اُنھوں نے اُس کی گردن پر پاؤں رکھا اور گویا ہوئے ’’اے اللہ کے دشمن! آخر کار تجھے اللہ نے رسوا کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اُس کا سر کاٹا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا ’’اُس اللہ کی قسم، جس کے سِوا کوئی معبود نہیں۔‘‘ اس کے بعد فرمایا ’’اللہ اکبر، تمام حمد اللہ کے لیے، جس نے اپنا وعدہ سچ کر دِکھایا۔ اپنے بندے کی مدد فرمائی اور تنہا سارے گروہوں کو شکست دی۔‘‘ پھر فرمایا ’’چلو! مجھے اس کی لاش دکھاؤ۔‘‘ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لاش دیکھ کر فرمایا ’’یہ اس قوم کا فرعون تھا‘‘ (سنن ابی داؤد)۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کے اور بہت سے کارناموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ابو جہل کو آپ ہی نے جہنم رسید کیا۔ حضرت ابن مسعودؓ غزوہ بدر کے علاوہ غزوہ احد، خندق، خیبر نیز فتح مکہ وغیرہ میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔ جنگ احد میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انتقال کی غلط خبر پھیلنے سے مایوسی کے نتیجے میں جو افراتفری پھیل گئی تھی، اس وقت بھی حضرت ابن مسعودؓ ثابت قدم رہے اور آپ کے ساتھ ساتھ رہے۔ غزوۂ حنین میں جب مسلمانوں میں بھگدڑ مچی تو سوائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسی (۸۰) صحابہؓ کے بقیہ دس ہزار کی جماعت پیچھے ہٹ گئی۔ حضرت ابن مسعودؓ ان اسی (۸۰) صحابہ میں سے تھے، جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم تقریباً اسی (۸۰) قدم پیچھے ہٹے ہوں گے پھر ہم اپنی جگہ ثابت قدم ہو گئے اور دیوانہ وار لڑنے لگے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خچر پر سوار تھے، وہ آپ کو لے کر چل رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زمین کی طرف جھکے تو میں نے سبب دریافت کیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ’’مجھے ایک مٹھی خاک اٹھا کر دو!‘‘ میں نے اٹھا کر دے دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ مٹی کفار کی طرف پھینک دی اور ان کی آنکھیں مٹی سے بھر گئیں۔

پھر آپ نے مجھ سے فرمایا کہ ''مہاجرین اور انصار کہاں ہیں؟'' میں نے اشارہ سے بتایا کہ وہاں ہیں۔آپ نے فرمایا ان کو پکارو، میں نے ان کو زور سے پکارا تو وہ ہاتھ میں تلواریں لئے آگئے اور یکا یک مشرکین پر ایسے ٹوٹ پڑے کہ مشرکین پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگے، ان کی تلواریں ایسی چمک رہی تھیں جیسے بادل میں بجلی چمکتی ہے۔اس طرح میدان جنگ سے مشرکین بھاگ کھڑے ہوئے اور ان کی فتح شکست سے بدل گئی۔

عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں:

زندگی بھر تادمِ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہے، نہایت ذوق وشوق اور خوب اہتمام کے ساتھ تحصیلِ علمِ دین، ہمہ دم استفادہ، اور ہر لمحہ کسبِ فیض میں مشغول ومنہمک رہے، صحبت ومعیت کا مبارک سلسلہ بدستور جاری رہا، اسی کیفیت میں مدینہ میں وقت گذرتا رہا، حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک دور گذر گیا، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تادمِ آخر ان سے انتہائی خوش، مسرور اور مطمئن رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک دور گذر جانے کے بعد خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بھی عبداللہ بن مسعودؓ کی یہی حیثیت اور قدر ومنزلت برقرار رہی۔خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانۂ خلافت کے دوران مشرق ومغرب میں چہار سو اسلامی فتوحات کا سلسلہ بہت وسعت اختیار کر چکا تھا، ایسے میں حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں میں نئے شہر بسانے کا حکم جاری کیا، چنانچہ اسی سلسلے میں انہی دنوں سن سترہ ہجری میں دریائے فرات کے کنارے ایک نیا شہر ''کوفہ'' بسایا گیا، جو کہ رفتہ رفتہ علمی، ادبی، ثقافتی، سیاسی، عسکری غرضیکہ ہر لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مزاج میں یہ بات شامل تھی کہ وہ خداداد بصیرت، فراست اور دور اندیشی کی وجہ سے اہم اور حساس قسم کے مناصب کے لیے ذمہ دار افراد کی تقرری کے معاملے میں بہت زیادہ احتیاط اور باریک بینی سے کام لیا کرتے تھے۔چنانچہ جب یہ نیا شہر (کوفہ) بسایا گیا تو اس کے والی (گورنر/فرمانروا) کے تقرر کے لیے ان کی نظرِ انتخاب حضرت عمار بن یاسرؓ پر پڑی، اور تب انہوں نے اس نو آباد شہر (کوفہ) کے اولین فرمانروا کی حیثیت سے حضرت عمار بن یاسرؓ کی تقرری فرمائی؛ جبکہ اسی موقع پر حضرت عمرؓ نے اہلیانِ کوفہ کی دینی تعلیم وتربیت اور رہنمائی کی غرض سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو منتخب فرمایا، ساتھ ہی انہیں یہ تاکید بھی کی کہ وہ تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ بوقتِ ضرورت انتظامی امور میں حضرت عمار بن یاسرؓ کے ساتھ تعاون ومشاورت کے فرائض بھی انجام دیتے رہیں، پھر ان دونوں انتہائی جلیل القدر شخصیات کو کوفہ پہنچنے کی تاکید فرمائی۔

اس موقع پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اہلیانِ کوفہ کے نام ایک خط بھی تحریر فرمایا: ''میں تم لوگوں کی طرف عمار بن یاسر کو تمہارے فرمانروا کی حیثیت سے؛ جبکہ عبداللہ بن مسعود کو تمہارے لئے معلم و مربی نیز عمار بن یاسر کے وزیر و مددگار کی حیثیت سے بھیج رہا ہوں، یہ دونوں حضرات انتہائی شریف و نجیب قسم کے انسان ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابۂ کرام میں سے ہیں نیز ''غزوۂ بدر'' میں شرکت کرنے والے خوش نصیبوں میں سے ہیں''۔

علالت ووفات:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ''کوفہ'' کے باشندوں کی دینی تعلیم وتربیت کی غرض سے کافی عرصہ وہاں گزارا، اور پھر خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفانؓ کے زمانۂ خلافت میں معزول ہو کر واپس مدینہ چلے آئے، جہاں رفتہ رفتہ عمر میں اضافے کے ساتھ طبیعت بھی ناساز رہنے لگی۔ انہی دنوں جب طبیعت کافی زیادہ ناساز ہو چکی تھی اور بچنے کی امید بظاہر کم تھی، تب ایک روز خلیفۂ وقت حضرت عثمان بن عفانؓ ان کی عیادت کے لیے آئے، اس موقع پر ان دونوں جلیل القدر حضرات کے مابین درجِ ذیل گفتگو ہوئی:

☆ حضرت عثمانؓ: اس وقت آپ کیا تکلیف محسوس کر رہے ہیں؟

☆ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: بس اپنے گناہوں کی وجہ سے پریشان ہوں!

☆ حضرت عثمانؓ: تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟

☆ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: اپنے رب کی رحمت!

☆ حضرت عثمانؓ: کیا میں آپ کی وہ رقم آپ کی طرف بھجوا دوں جو کہ سالوں سے آپ نے وصول نہیں کی ہے؟'' (حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ میں بطورِ مدرس جو فرائض انجام دیا کرتے تھے، آخری دنوں میں کافی عرصہ اس کیفیت میں گذرا کہ انہوں نے سرکاری بیت المال سے اپنا جائز وظیفہ وصول نہیں کیا، مفت میں خدمات انجام دیتے رہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عثمانؓ نے یہ پیش کش کی تھی)

☆ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

☆ حضرت عثمانؓ: وہ رقم آپ کے بعد آپ کی بیٹیوں کے کام آئے گی (اس لئے آپ وہ رقم قبول کر لیجئے)

☆ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: مجھے اپنی بیٹیوں کے بارے میں فقر وفاقے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے، کیوں کہ میں نے انہیں یہ تاکید کر رکھی ہے کہ ہر رات سورۃ الواقعہ ضرور پڑھ لیا کریں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ

ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: جو کوئی ہر رات سورۃ الواقعہ پڑھے، وہ کبھی فقر و فاقے کا شکار نہیں ہوگا۔

اس واقعے سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بے مثال زہد و استغناء ظاہر ہوتا ہے کہ خلیفۂ وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ خود چل کر ان کے پاس تشریف لائے اور بار بار خود انہیں اس رقم کی پیشکش کی؛ لیکن جواب میں انہوں نے مسلسل معذرت کا اظہار کیا۔

نیز اس سے ان کے دل میں موجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مذکورہ بالا ارشاد (بلکہ آپؐ کے تمام ارشادات وفرمودات) پر مکمل اور غیر متزلزل یقین وایمان کا اظہار ہوتا ہے؛ کیونکہ اسی یقین وایمان کی وجہ سے انہوں نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت بالکل آخری دنوں میں اپنی صاحبزادیوں کو اس چیز (یعنی ہر رات سورۃ الواقعہ کی تلاوت) کی تاکید و تلقین فرمائی۔ مزید یہ کہ اس طرح ہمیشہ کے واسطے تمام مسلمانوں کو بھی فقر و فاقہ اور تنگدستی سے حفاظت ونجات کے لیے یہ نافع ومفید نسخۂ اکسیر بتا گئے۔ (ملخص از: اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

آپؓ کی وفات مدینہ منورہ میں ۳۲ھ میں ہوئی، اس وقت آپ کی عمر ساٹھ سال سے زائد تھی، علامہ واقدی کے مطابق آپؓ کی نمازِ جنازہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پڑھائی اور حسبِ وصیت آپ کو حضرت عثمان بن مظعونؓ کے پہلو میں ''بقیعِ غرقد'' میں دفن کیا گیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ

(بقیہ صفحہ: ۳۹ سے)

(۴) دعاء کی قبولیت کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود شریف پڑھنا شرط ہے اور درود شریف دھیان سے پڑھیں ترجمہ ذہن میں رکھ کر پڑھیں تا کہ آگے آنے والی آخری دعا قبول ہو جو عبادت کا نچوڑ اور مغز ہے، اور خود دعاء ہی بغیر سوچے سمجھے پڑھ لی تو خدا حافظ سب محنت پر پانی پھر گیا۔ سلام کے بعد اللہ اکبر اور تین بار استغفر اللہ پڑھ لیں نماز میں کمی یا کوتاہی کا ازالہ ہو جائے گا۔ مزید اپنی نماز کو قیمتی بنانے میں ہر نماز کے بعد اس دعا کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کریں: رب اعنی علی ذکرك وشكرك وحسن عبادتك.

اس طرح آپ نفس وشیطان پر ایک دن ضرور غالب آجائیں گے شیطان ناکام ہونے کی صورت میں نماز کے علاوہ بھی آپ کو بُرے خیالات ڈالے گا اس وقت آپ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھ لیا کریں۔

اصلاحی مضامین

سبق ملا مجھ کو ابراہیم سے وفا کا

از: مولانا توفیق عبید سبیلی *

ذی الحجہ اسلامی کیلنڈر کا آخری مہینہ ہے، اور اس مہینہ کی بہت سی یادگاریں ہیں جو دنیا بھر کے ہر مسلمان کے ذہن میں اس طرح پیوست ہیں کہ اس کا محو ہونا ناممکن ہے۔ یوں تو اسلامی سال کی ابتداء بھی قربانی سے ہے اور اس کا اختتام بھی قربانی پر ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے بڑے حسین پیرائے میں اس ساری داستان کو سمیٹ دیا اور اسلامی تاریخ کا پورا نچوڑ گویا سمندر بکوزہ کر دیا

غریب وسادہ ورنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

حج ہو یا قربانی یہ اس خاندانِ خلیل کی بے مثال اداؤں کی یاد ہے جو بارگاہ خداوندی میں قبولیت کی معراج کو پہنچ گئیں تھیں۔ جس گھرانے کے ایک ایک فرد کو آزمائش کے ہمالیہ سے گزارا گیا، جن کی صعوبتوں کی تپش نے سورج کی گرمی کو بھی مات دے دیا اور جن کی ہمت واستقلال نے بڑے بڑے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیا جو محبت خداوندی میں ساری ظاہری محبتوں سے بے پرواہ ہو گئے، عقل حیران ودل پریشان ہے کہ کیا اس طرح بھی کوئی انسان اپنے جذبات ومحبتوں کی قربانی دے سکتا ہے، آج بھی ذہن ماؤف ہو جاتا ہے اور دل پر ایک لرزہ طاری ہو جاتا ہے جب اس منظر کا تصور بھی کیا جاتا ہے۔ کیا حالت رہی ہوگی اس بوڑھے باپ کی اور کیا گزر رہی ہوگی اس کے دل پر جس نے مدت دراز کے بعد اولاد کی نعمت پائی تھی اور بڑی چاہتوں اور ناز سے اس کی پرورش کی تھی۔ ابھی عقل وبلوغت نے اپنے پاؤں نہیں پھیلائے تھے، اور نہ اس نوخیز عمر کے بچے کا شعور اتنا بلند ہوا تھا، وہ تو لڑکپن کے خوشگوار دن تھے جہاں ماں باپ کی محبتیں اولاد پر بے تحاشا برستی ہیں۔ اس کی ایک ایک حرکت پر دل سو جان سے نثار ہو جاتا ہے، اس کا بولنا، چلنا، کھانا، پینا، سونا، جاگنا ہر ادا ماں باپ کے لئے ایک خوش کن منظر ہوتا ہے۔ یہ انسانی فطرت بھی ہے کہ آدمی صرف چند دن میں کسی ساتھ رہنے والے کی انسیت اپنے دل میں محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کی جدائیگی سے وہ مضطرو بے چین ہو جاتا ہے ایک جانور کو ہی اگر پالا جائے تو اس

* استاذ جامعہ الطاہرات حیدرآباد

کی عدم موجودگی سے پریشان ہوتے کتنی آنکھوں نے دیکھا ہوگا۔ یہ تو انسان تھے اوران کے دل میں انسیت و محبت موجزن تھی؛ لیکن چوں کہ ابراہیمؑ کے پیشِ نظر نبوت، ابوّت پر فائق تھی، یہاں ابوّت ونبوّت کی کشمکش ہوگئی ،ربّ جلیل کو بتانا تھا کہ میں نے ابراہیمؑ کو یوں ہی خلیل کا درجہ نہیں دیدیا، اپنے دربار میں قبولیت ایسے ہی عطا نہیں کردی، اس کے خاندان کو نبوّت کے ایک لمبے سلسلے کے لئے ایسے ہی نہیں چنا، وہ سبب ساری دنیا کو بتادیا جس کو دیکھ کر ہرکوئی انگشت بدنداں رہ گیا۔ عقل نے ساتھ دینے سے انکار کردیا، ذہن کے سارے دریچے وَا ہوگئے، تسلیم ورضا کے سارے بت سجدہ ریز ہوگئے، اَداووفا کے سارے راستے ختم ہوگئے، دینے والا اور دیا ہوا کا فرق واضح ہوگیا۔ جس کا تھا اس کے مانگنے پر بلاجھجک دینے کا نرالا انداز بھی دنیا نے دیکھا۔ مرزا غالب کا ایمان سے مغلوب انداز دیکھیں ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

وفا اسی کو کہتے ہیں کہ محبوب کے اشارۂ ابرو کو پرکھ لے۔ حکم دے کر کام کرانا یہ تو غلاموں کی روایت ہے نبی وخدا کا رشتہ آقا وغلام سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ کسی فرشتہ کے ذریعہ وحی نہیں تھی کہ ابراہیم ایسا کرنا ہے وہ تو ایک خواب دکھایا گیا کہ تم اپنے جگر گوشہ کو رب کے حضور قربان کررہے ہو پر آفرین ہے ان باپ بیٹے پر جنہوں نے خواب کو حکمِ رب بھی سمجھا اور ایک دوسرے کو آناً فاناً تیار کرلیا۔ باپ بیٹے کو کہہ رہا ہے جس نے تمہیں دیا ہے وہ مانگ رہا ہے۔ قربان جاؤں اس بیٹے کی اطاعت پر، سو جان نثار اس کی فرمانبرداری پر، ہزاروں سلام ہو اس کی ہمت واستقامت پر، اس نے اپنے صبر واستقلال کی یقین دہانی کراتے ہوئے کہا کہ رب نے مانگا ہے تو میں بسروچشم حاضر ہوں ۔ ابلیس مع اپنے بھکتوں کے اطاعت وفرمانبرداری کے اس انوکھے منظر کو دیکھنے حاضر تھا آسمان کے فرشتوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی، سارے آسمانوں میں ایک سناٹا چھایا ہوا تھا، دل کی دھڑکنیں قابو میں نہیں تھیں ۔ مانگے ہوئے نے مانگنے والے سے کہا کہ جس سے مانگا ہے اس کو دینے میں کیا تردد؟ اگر کچھ خیال رکاوٹ بن رہا ہو تو آنکھیں بھی بند کرلو اور کرگزرو جو کہا گیا ہے اِفۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ چشم فلک نے وہ نظارہ پہلے دیکھا اور نہ بعد میں وہ ضرورت پیش آئی، زمین پر وہ ایسی پہلی قربانی تھی جو رب نے اپنے بندے سے مانگی تھی، مقصود وفا تھی جو بندے نے ادا کی، بندگی تو یہی ہے کہ جب، جو اور جیسا حکم ہو بلا چوں وچرا سرتسلیم خم ہو۔

قیل وقال کی گنجائش طاعت وعبادت میں نہیں ہے، اس کو بندگی نہیں کہا جائیگا وہ دل لگی کہلائے گی، بندگی تو یہی ہے کہ سمجھ آئے یا نہ آئے حکم پورا ہوجائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے تسلیم ورضا ،صبر واستقامت کے سارے

پیمانے بدل دئے اب نہ ویسا امتحان ہوگا، اور نہ ویسا شریک امتحان، ممتحن نے جس کے انداز امتحان کو رہتی دنیا تک کے لئے معیارِ محبت بنا دیا، اور اس کے سارے مراحل کو اپنی عبادت کا حصہ بنا دیا، حج کے سارے مراحل ابراہیمؑ واہل ابراہیمؑ کی اداؤں ووفاؤں سے معنون ہیں، جو وہاں جا کر ان مراحل کے ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے ان کو اپنے مقام پر رہ کر قربانی کی ادائیگی کا پابند بنایا گیا۔ تاکہ کسی جگہ وہ عمل رکے نہیں، اور ہر جگہ کے لوگ بندگی کا انداز یکسانیت سے ادا کرتے ہوئے وفائے ابراہیمی اور ادائے اسماعیلی کو خراجِ عقیدت پیش کریں فریضۂ حج ادا کرنے والے حاجی ہوں یا قربانی کرنیوالے صاحب نصاب سب کے لئے اصل اس پیغام کو سمجھنا ہے جو اس کا مقصود ومطلوب ہے، ورنہ کعبہ کا طواف اور صفا ومروہ کی سعی اور قیام منیٰ ومزدلفہ، رمی جمار وحلق اور قربانی یہ سب ادا کرنا ہی اصل نہیں ہے۔ ان سب کے ذریعہ اس وفا اور ادا کو اپنے اندر پیدا کرنا ہے جو اس کی ابتداء کرنیوالوں کی پہچان تھی۔ اور یہ یقین بھی پیدا ہو جائے کہ دینے والے کو اگر واپس کیا جا رہا ہے تو اس کو لینے کی حاجت نہیں ہے وہ تو بس آزمانا چاہتا ہے کہ ہم اس کے نام پر کیا کچھ دے سکتے ہیں، اور دیتے ہوئے ہمارے دل میں کس کی محبت جھلکتی ہے جو بخوشی اس کے نام پر اپنی محبوب چیز کو قربان کردے وہ امتحان میں کامیاب سمجھا جائے گا اور اس کا دیا اسی کو لوٹا دیا جائیگا اس کے پاس بس دینے والی کی نیت اور اخلاص پہنچتا ہے نہ کہ اس کا کچھ حصہ تاکہ ہم انسان اپنے رب کے انداز عطا کو محسوس کرسکیں، وہ مانگتا تو ہے پر لیتا نہیں، نام اس کا ہوتا ہے پر کام تو اپنا ہی ہے، اور دینے والوں کے اندر وہ جذبات ممنونیت ہونا چاہئے کہ اس نے ہمارے مال کو قبول کیا اور اس کی قبولیت کے لئے وہی انداز اختیا کرنا چاہئے جو تعمیر کعبہ کے بعد حضرت ابراہیمؑ واسماعیلؑ نے اختیار کیا تھا۔ گرچہ وہ کام انہوں نے اپنی طرف سے نہیں کیا تھا بلکہ ان کو حکم دیا گیا تھا اس بناء کا۔ باوجود اس کے ان دونوں نے عاجزی ومسکنت اور بندگی وعبدیت کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے اپنے رب کے حضور اس تعمیر کی قبولیت کی دعا مانگی رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْم گرقبول افتدزہے عزوشرف

ہم کو بھی چاہئے کہ ہم اسی طریق کو اپنائیں اور اپنی عبادتِ حج وقربانی کو رب کے حضور قبول کروائیں۔ اپنے اور اپنی اولاد میں اطاعت وبندگی کے جذبات اسی طرح پیدا کرنے کی فکر کریں جو خاندانِ ابراہیمؑ کی پہچان ہیں۔ نمازوں میں صل علیٰ ابراھیم پڑھتے ہوئے تصور کریں کہ کیوں اس خاندان کو یہ قبولیت حاصل ہوئی اگر ہم آج بھی وہ محنت کریں گے تو کسی نہ کسی درجہ میں قبولیت کو پاسکتے ہیں کہ ع

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

خدا کی قوتِ عطا میں کوئی کمی نہ تھی نہ ہوئی نہ ہوگی، اس ماہ مبارک کے پیغام کو آج ہم سمجھ کر اور اپنی اولاد

وازواج کو سمجھائیں گے تو کوئی بعید نہیں ہے دور حاضر کے نمرود وفرعون کو خدا اسی طرح نیست ونابود کرے جیسے اس وقت کیا تھا۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

عید قرباں کو صرف بڑی عید سمجھ کر نہیں بلکہ جذبہ اطاعت وفرمانبرداری سے معمور کر کے اپنے سال کا اختتام کریں اور اسلامی مہینوں کی جو تاریخ قربانیوں سے عبارت ہے اس کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں اور خاندانِ براہیمی سے سبق لیں کہ انہوں نے دنیا کی ہر آلائش کو چھوڑنا گوارا کیا، ناقابل تصور قربانیوں کو خدا کے حضور پیش کر کے ہم سب کو یہ سبق دیا کہ انسان اگر رب کی اطاعت میں سچا ہو تو اس کو کسی رکاوٹ سے روکا نہیں جاسکتا۔ ایک ماں کا اپنے نومولود بچہ کے ساتھ بے آب وگیاہ صحراء میں رہنے کو گوارا کرنا اور اس کو رب کا حکم سمجھ کر پیکر تسلیم بن جانا اور پھر کسی حرف شکایت کا زبان پر نہ لانا یہ امت کی ماؤں کے لئے بڑا سبق ہے، اس ماں پر جو گزری ہوگی، اس کا تصور بھی روح کو لرزانے والا ہے۔ ہزاروں سلام ہوں اس جرأت مند ماں پر جس نے تاقیامت آنے والوں کو اطاعت وایثار کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ رب ذوالمنن نے اس کو ایک مستقل عبادت ہی بنادیا، اور اسلام کا اہم رکن قرار دیا، ایک وہ ماں تھی جس نے رب کی رضا میں راضی رہنے کا گُرامت کو دیا، آج معمولی سہولیات کی کمی پر اوران کے مہیا نہ ہونے پر گھروں کے ٹوٹنے کے واقعات روز افزوں ہے۔ ہم اپنے بچوں کے نام تو ان ناموں پر رکھتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں لیکن ان کی زندگی اور سیرت سے اتنا ہی ناواقف ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ایمانی جذبات واحساسات ہمارے اندر سے عنقا ہوتے جارہے ہیں، ان مواقع پر خصوصاً ہم سب مسلمانوں کو تاریخ اسلامی اور اسوۂ ابراہیمی سے واقف ہونا اپنی ایمانی ذمہ داری سمجھنا چاہئے، مقام حیرت ہے کہ مسلمان ابھی بھی اس عید کو صرف جانور کی قربانی تک محدود سمجھتے ہیں، اس میں بھی عموماً گوشت کا حصول مقصد ہوتا ہے، شاذونادر ہی ایسے لوگ ہیں جو رضائے الٰہی کے خاطر اس عمل کو انجام دیتے ہیں، حج ہو یا قربانی ان سب میں حصول رضائے رب کو اولیت دیں پھر اس کے نفع کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں، جو چیز بھی اللہ کے نام پر اس کی رضا کے لئے لگتی ہے اس میں برکت ووسعت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں اور جس میں اطاعت اور محبوب کی رضا ہو اسی کو وفا کہتے ہیں، اپنی پسند اور سہولت کو چھوڑنا اور حکم ربانی کو بروقت پورا کرنا وفا کا اصل تقاضا ہے، جو واقعہ ابراہیمی میں جابجا نظر آتا ہے، ایک معصوم بچہ، ایک شفقت وہمدردی رکھنے والا باپ اور ممتا بھری محبت کی پیکر ماں کے اداؤں، وفاؤں اور ایثار وقربانی کو حج اور قربانی کا یادگار نام دیکر جاوداں بنادیا گیا۔

اصلاحی مضامین

قربانی پر گوشت خوری کا اعتراض اور اس کا عادلانہ تجزیہ

از: مولانا محمد سلمان قاسمی محبوب نگر*

انسان جب اپنی مملوکہ شئی کو استعمال میں لاتا ہے یا اس میں کسی نوع کا تصرف کرتا ہے تو دوسرا شخص اس پر اعتراض یا نکتہ چینی کرنے کا کسی بھی طرح مجاز نہیں ہے، کیوں کہ دنیا کا یہ ضابطہ اور نظام ہے کہ مالک اپنے مملوک میں حسب منشا تصرف کرسکتا ہے، جس طرح چاہے کام میں لاسکتا ہے، یہ ایک مسلم امر ہے، ملحدین اور متعصبین کے علاوہ دیگر اقوام و دیگر مذاہب کے لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس ساری کائنات اور کائنات کے ہر ہر ذرہ کے تنہا خالق اور ان تمام کے بلاشرکت غیر حقیقی مالک اللہ رب العزت والجلال ہیں، جب اللہ تعالیٰ ہی تمام کوائن وموجودات کے اصل مالک ہیں تو وہ اپنی مخلوق و مملوک میں ہر طرح کے تصرف کا مکمل استحقاق رکھتے ہیں، اس کے کسی نظام یا اس کے کسی تصرف پر انگشت نمائی عقل ونظر کے تو خلاف ہے ہی، ساتھ ہی یہ اپنے مالک وآقا کے خلاف ایک طرح کی بغاوت اور جرأت مندی ہے، با ایں وصف کچھ کوتاہ عقل ہندو لوگ خدا تعالیٰ کی جانب سے انسانوں کے لیے گوشت خوری کی اجازت اور شریعت اسلامیہ میں گوشت کھانے کی حلت اور بالخصوص رسم قربانی کو ایک ظالمانہ حرکت بتا کر اسلام اور اہل اسلام پر سخت طعن کرتے ہیں، حالاں کہ گوشت خوری کا شرع و مذہب کی قید سے بالاتر ہو کر محض عقل کی بنیاد پر جائزہ لیا جائے تب بھی اعتراض کا کوئی جواز نہیں، ذیل میں مذکور نکات کو سامنے رکھتے ہوئے جائزہ لیں کہ ایا ہندوؤں کا یہ اشکال برحق ہے یا محض کم علمی، کم فہمی اور عناد پر مبنی ہے۔

(۱) اللہ تبارک وتعالیٰ نے ساری مخلوق میں انسان کو اشرف اور اعلیٰ بنایا ہے، قرآن پاک میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا** (الاسراء ۷۰) ترجمہ: اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو عزت دی اور ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا اور ان کو ستھری چیزیں روزی دیں اور ان کو اپنی بہت مخلوق سے افضل کیا۔

مذکورہ آیت سے معلوم ہوا کہ ساری مخلوق خدا میں انسان سب سے اعلی ہے، اور تمام خلقت پر اس کو فضیلت اور برتری عطا کی گئی ہے، دنیا کا یہ رواج اور دستور ہے کہ اعلی کے فائدے کے لئے ادنیٰ سے کام لیا

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

جائے، اور ایک کے مفاد کی خاطر دوسرے کی قربانی دی جائے، جیسے ایک بادشاہ اور اس کے خدام کہ بادشاہ کے آرام وآسائش کی خاطر چاہے جتنے خادمین کو مشقت برداشت کرنا پڑے، اس کی جان بچانے کے لیے جتنے سپاہی چاہے اپنی جان گنوا بیٹھے، کوئی شخص اس کو اپنی نظر میں برا نہیں مانتا، نیز جب ایک اچھے شاندار مکان کی تعمیر مقصود ہو تو پرانے اور بوسیدہ مکان کو منہدم کر کے تہس نہس کر دیا جاتا ہے، اور یہی عین فطرت بھی ہے، جب دنیا کا دستور ہی کچھ اس طرح ہے تو انسان کو جو کہ ساری مخلوق میں اعلی ہے دیگر مخلوقات کو اپنے مفاد اور راحت کی خاطر استعمال کرنے کی پوری اجازت ہوگی، اور من جملہ دنیاوی مخلوقات کے انعام اور چوپائے ہیں، چنانچہ انسان کے لئے ان پر سوار ہونا بار برداری کرنا اور ان کی ہڈیوں اور کھالوں سے بنی ہوئی اشیاء کا استعمال کسی کے نزدیک بھی برا نہیں ہے، کیوں کہ ان کی خلقت اور وجود کا مقصد ہی نوع انسانی کی خدمت اور اس کا مفاد ہے، جب ان سب چیزوں کی مسلمہ طور پر اجازت ہے تو لا محالہ ان کا گوشت کھانا اور ان کو انسانی غذا بنانا بھی بالکل موافق عقل وقیاس ہے۔

(۲) حکیم مطلق باری تعالیٰ نے تمام جان دار مخلوق کی تخلیق میں ایک عجیب نکتہ ملحوظ رکھا ہے جس سے بھی صاف ہویدا ہوتا ہے کہ گوشت خوری کوئی خلاف عقل جرم نہیں بل کہ عین تقاضائے فطرت ہے، استاذ محترم مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی دامت برکاتہم اپنی ایک تالیف میں ارقام فرماتے ہیں:

”بعض جانوروں کے اندر صرف ایسے دانت رکھے گئے ہیں جو نباتات کو چبانے کے کام آتے ہیں، جیسے گائے، بیل وغیرہ؛ ان کے منہ میں نوکدار دانت نہیں ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کی خوراک نباتات ہے، بعض جانور وہ ہیں جن کے سارے دانت نوکدار ہیں، جس سے گوشت کھایا جاسکتا ہے، جیسے شیر، بھیڑیا، کتا وغیرہ، یہ اس بات کی علامت ہے کہ گوشت وغیرہ ہی ان کی خوراک ہے، انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دونوں طرح کے دانت پائے جاتے ہیں، وہ بھی جن کے ذریعہ نباتات کھائے جاتے ہیں، اور وہ بھی جن کے ذریعہ گوشت کو خوراک بنایا جائے، اس میں یقیناً قدرت کا اشارہ ہے کہ انسان کو لحمی وغیر لحمی دونوں طرح کی غذا استعمال کرنا چاہئے۔“ (اسلام پر بے جا اعتراضات ص: ۵۳۶)

(۳) قدرتی طور پر جسم انسانی کے عناصر ترکیبیہ ہی کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ اس کی پرورش وافزائش میں گوشت کا استعمال ناگزیر ہے، نیز گوشت کے استعمال سے جسم توانا وطاقت ور اور جلد شفاف ہوتی ہے، سائنس کی تحقیق ہے کہ انسانی جسم کی نشوونما اور پروٹین کے لیے اس کو 23 ایمینو ایسڈ (amino acid) کی ضرورت ہوتی ہے، ان میں سے 8 یا 9 ایمینو ایسڈ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی پیداوار انسانی جسم میں نہیں ہوتی بل کہ غذا

کے ذریعہ ہی ان کو حاصل کیا جاسکتا ہے، اب کسی بھی سبزی کے اندر یہ صفت نہیں کہ وہ ان آٹھ ایمینو ایسڈ کو پیدا کرے البتہ گوشت میں آٹھوں ایمینو ایسڈ موجود ہوتے ہیں تو گویا مکمل پروٹین ہم کو صرف گوشت ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اس انکشاف سے قطع نظر غذا کے طریق پر نہ سہی، دوا کے طور گوشت کے استعمال سے تو انسان مجبور ہوتا ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ بیشتر ادویات کے مادے میں گوشت شامل ہوتا ہے، اور گوشت کی شمولیت کے بغیر وہ دوا کارگر بھی نہیں ہوتی، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ گوشت کا استعمال انسان کے لیے صرف اشتہاء نہیں بل کہ ایک طبعی ضرورت ہے۔

(٤) ہندوؤں کے ایک مخصوص طبقے سے قطع نظر تمام مذاہب وممالک کے لوگ گوشت خوری پر متفق ہیں، از شرائع سابقہ تا مذاہب موجودہ شاید وباید کوئی ہوگا جو انسان کے لیے گوشت کے استعمال کو ناجائز قرار دے، چناچہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی اپنے تحفہ لحمیہ نامی رسالے میں لکھتے ہیں کہ:

”ظاہراً یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب ومشرب میں اس کا رواج ہے، ہنود میں بھی بہت سی قومیں اوروں کی شریک ہیں، بل کہ خود تو خود اپنے معبودوں کے لیے بھی مثل دیبی وغیرہ بکروں کا جھٹکا کر کے نظر کرتے ہیں۔

(تحفہ لحمیہ ص۱۲)

ہندو مذہب میں گوشت خوری کا ثبوت:

اس وقت کے ناسمجھ اور کم علم ہندو لوگ جن کو اپنی مذہبی کتابوں کا جن پر سناتن دھرم کا مدار ہے مطالعہ تو کیا! علم بھی نہیں ہوتا، حالاں کہ خود ان کی مذہبی کتابوں میں گوشت کھانے اور جانوروں کی قربانی اور چڑھاوے کا ثبوت موجود ہے۔

رگ وید میں ہے: اۓ اندر! تمہارے لیے پسان اور وشنو ایک بھینس پکائیں گے۔ (رگ وید ٦/۱۱-۱۷)

یجر وید میں گھوڑوں، سانڈ، بانجھ گایوں، بیلوں، اور بھینسوں کو دیوتا کی نظر کرنے کا تذکرہ ملتا ہے۔

(یجر وید، ادھیاے ۷۸/ ۲۰)

منوسمرتی میں مکتوب ہے: مچھلی کے گوشت سے دو ماہ تک، ہرن کے گوشت سے تین ماہ تک، بھیڑیے کے گوشت سے چار ماہ تک، اور پرند کے گوشت سے پانچ ماہ تک پتر آسودہ رہتے ہیں۔ (منوسمرتی ادھیاے ۲٦۸/ ۳)

منو جی نے نہ صرف گوشت کھانے کی اجازت دی، بل کہ اس کی ترغیب بھی دی ہے، اور گوشت نہ کھانا لائق سزا جرم قرار دیا چنانچہ کہتے ہیں: گوشت خور روزانہ شکار کرتا ہے، اور گوشت کھاتا ہے، اور یہ کوئی گناہ نہیں، اس لئے کہ کھانے والے اور کھائے جانے والے دونوں کو خالق نے (اسی غرض سے) پیدا کیا۔ (منو باب ٥، اشلوک. ۳۰)

ایک شخص جو گوشت کھانے سے انکار کرتا ہے مرنے کے بعد اکیس جنم تک وہ جانوروں کے روپ میں رہتا ہے۔(منو باب ۵ اشلوک ۴۵)

حضرت نانوتوی لکھتے ہیں: جو شاستر کو جانتے ہیں اور بید پران کو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جس وقت کہ برہمن زادہ تحصیل علم کر کے گھر آتا تھا، گاؤ کی قربانی کر کے کچھ کیا کرتے تھے، اگر اس بات کو ظلم یا حرام جانتے تو ایسے وقتِ شکر میں جو اچھے کاموں اور عبادتوں کا وقت ہے ہرگز (یہ کام یعنی گاؤ کی قربانی) نہ کرتے، بل کہ نام سے بھی برا مانتے۔(تحفۃ لحمیہ ص:۱۳)

مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوا کہ جانوروں کا خون بہانا، قربانی کرنا، چڑھاوا دینا اور گوشت کھانا خود ہندو مذہب میں جائز و رائج ہے، بل کہ بعض جگہ تو ترغیب بھی دی گئی ہے، بایں وصف مسلمانوں پر گوشت خوری کا الزام لگانا، اور رسم قربانی کو ظلم قرار دے کر اسلام کے شعائر پر اعتراض چہ معنی دارد!

گوشت خوری پر سب سے بڑا اعتراض اور اس کا مسکت جواب:

ہندوؤں کا گوشت خوری کو لے کر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں "جیو ہتیا" ہے، یعنی اپنی لذت اور مفاد کی خاطر ایک جانور کو بلی چڑھانا کہاں تک درست ہے، گویا یہ ایک طرح سے جانوروں پر ظلم ہے، ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب کی ایک تقریر میں نے یوٹیوب پر سنی جس میں۔ وہ ایک سائنسی تحقیق پیش کر رہے تھے کہ صرف جانوروں میں جان ہوتی ہے یہ سمجھنا بالکل غلط ہے، آج کی سائنس کہتی ہے کہ پودوں اور سبزیوں میں بھی جان ہوتی ہے، اب اگر کوئی یہ کہے کہ جانوروں اور پودوں کی جانوں میں فرق ہے، جانور درد محسوس کرتے ہیں اور پودے درد محسوس نہیں کرتے؟ تو سائینس نے مزید ترقی کر کے اس کا انکشاف کیا کہ پیڑ پودوں کو بھی درد محسوس ہوتا ہے، وہ بھی چیختے چلاتے ہیں، البتہ ہماری قوت سماعت اس درجہ کی نہیں ہے کہ ان کے چیخ پکار کو سن سکیں، اس اعتراض کو تسلیم کر بھی لیا جائے کہ کسی کی جان لینا صحیح نہیں ہے، تو پھر ہمارا کچھ دیر کے لیے بھی جینا ممکن نہیں رہے گا کیوں کہ سائنس کہتی ہے کہ جب کبھی انسان سانس لیتا ہے تو سینکڑوں جراثیم مرجاتے ہیں، تو اب معترضین جو مذہبیات سے زیادہ مادیات کا اعتقاد رکھتے ہیں اس کا کیا حل نکالیں گے؟

غرض ان تمام باتوں کا حاصل اور خلاصہ یہی ہے کہ اسلام وغیر اسلام کی تفریق کے بغیر جانوروں کا گوشت متفقہ طور پر انسانیت کا حق ہے، لامحالہ انسان اس کے استعمال سے مجبور ہے، ہندوؤں کا گوشت کو بنیاد بنا کر اسلام اور اہل اسلام پر اعتراض اور عمل قربانی سے تعرض کم دانی اور ناواقفیت کی بنا پر ہے، یا محض منافرت اور عصبیت کی وجہ سے ہے۔

اصلاحی مضامین

نکاح کا اسلامی وسماجی تصور

مولانا محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی*

اسلام میں نکاح ایک مقدس مفہوم کا حامل لفظ ہے،اس کے تقدس کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ رحمت دو عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اپنی سنت قرار دیا ہے،نسبت و استناد کی بڑی اہمیت ہوتی ہے،نسبت سے اشیاء کی قدر و قیمت گھٹتی بڑھتی ہے اور اسی سے اشیاء میں روحانیت پیدا ہوتی ہے، اسی لیے اسلام میں نکاح صرف جنسی تسکین کا نام نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک عبادت بھی ہے۔ یاد رہے جس طرزِ حیات اور روشِ زندگی میں عبادت و سنت کی خوشبو رچی بسی ہوتی ہے وہ خوشبو شریعت فراہم کرتی ہے کیونکہ اسے اصلی و نقلی خوشبو کا علم ہوتا ہے، ورنہ ہماری آنکھیں تو ہر چمکتی چیز کو سونا خیال کرتی ہیں، روحانیت و مادیت کا امتیاز محض عقل کے ذریعہ انجام دینا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث وسیرت میں نکاح کے فضائل و مسائل تفصیل سے منقول ہیں، نکاح کرنے والے کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ بوقت نکاح ان امور کی رعایت کرے، تاکہ وہ نکاح کے انوار و برکات سے اپنی زندگی روشن رکھ سکے، اسلام نے نکاح کا جو تصور پیش کیا ہے اسی میں خیر و برکت ودیعت کی گئی ہے، اس کے سوا نکاح کا جو سماجی تصور ہمارے معاشرے میں نظر آتا ہے وہ اپنی تمام چمک دمک کے ساتھ روحانیت، خیر و بھلائی اور حقیقی سعادتوں سے خالی ہے، اہلِ دل اور صاحبِ نظر شخصیات اسلامی اور سماجی تصورات کا فرق نہ صرف یہ کہ سمجھتی ہیں بلکہ وہ فرق انھیں دکھائی دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ سماج کے ان تصورات سے اپنا دامن بچائے رکھتی ہیں جو تصورِ اسلام سے متصادم ہوتے ہیں، وہ ہر مسلمان سے اسی کی امید اور توقع رکھتی ہیں کہ وہ بھی اس معاملہ میں شریعت وسنت کے پاسدار رہیں، کیونکہ یہی مومن کی معراج ہے۔

اسلام ایک دینِ فطرت ہے جس کی ہر تعلیم میں رحمت کے ساتھ اعتدال پنہاں ہے، اسی اعتدال اور رحمت کی وجہ سے اس کے ہر طرز اور ہر رہنمائی میں آسانی موجود ہے، انسان جب اس اعتدال کی روِش سے ہٹتا ہے تو افراط وتفریط کی خاردار وادیوں میں گُم ہوجاتا ہے، اس وادی میں سنت کے لہلہاتے لالہ وگُل کے بجائے بدعات و خرافات، رسوم و رواجات اور ضلالت وگمراہی کے کانٹے دامنِ مراد میں الجھتے اور پھنستے چلے جاتے ہیں، کسی کو

* خادم تدریس دارالعلوم حیدرآباد

اس کا احساس ہوتا ہے اور کسی کو اس کا ادراک نہیں ہوتا، اسی لیے زندگی کے ہر موڑ پر اسلام کی رہنمائی اور سنت کی رہبری کا جاننا بے حد ضروری ہے؛ کیونکہ دینی علم اور صحیح جانکاری ہی ہر جہالت کا علاج اور ہر ضلالت کا مداوا ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ دورِ حاضر میں نکاح کو چند معاشرتی، سماجی رسم ورواج اور خاندانی طور طریقوں کو اپنانے کا نام سمجھ لیا گیا ہے، جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ نئی نئی برائیاں اور مختلف قسم کی دشواریاں جنم لے رہی ہیں جن سے اپنے اور پرائے سب پریشان ہیں۔

حیوانیت اور عبدیت

چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خواہشات کا مجموعہ بنایا ہے، اسی لیے خواہشات پر یکسر پابندی نہیں لگائی گئی ہے بلکہ ان انسانی خواہشات اور ان کے تقاضوں کی تکمیل کے اسباب و وسائل پیدا فرمائے ہیں، اور بطور آزمائش ان اسباب ووسائل کو استعمال کرنے اور ان کے ذریعہ اپنے تقاضوں کو پورا کرنے کے دو راستے متعین کیے ہیں: ایک راستہ میں عبدیت کی شان ہے جبکہ دوسرا راستہ حیوانیت سے موسوم ہے، جو نظامِ حیات رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش فرمایا ہے اور جس کے مطابق انھوں نے اپنی زندگی گذاری ہے اس کو پیشِ نظر رکھنا عبدیت کہلاتا ہے، اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے نبوی ہدایات کو بالائے طاق رکھ دینا اور اپنی مرضی اور صرف سماج کی رعایت کرنا حیوانیت کا دوسرا نام ہے، یاد رکھنا چاہیے عبدیت تمام شعبہ حیات میں مطلوب ہے یعنی جیسے نماز وروزہ اور حج وزکوٰۃ میں عبدیت اور بندگی مطلوب ہے ویسے ہی یہ عبدیت نکاح اور دیگر معاملات میں بھی ضروری ہے۔ یہ بھی گوشہ دل میں محفوظ رکھنا چاہیے کہ عبدیت کے راستے سے منزل تک پہنچنا نہ صرف یقینی ہوتا ہے بلکہ نہایت آسان اور باعثِ برکت ہوتا ہے جبکہ حیوانیت کا راستہ منزل مقصود کو بہت پیچیدہ بنا دیتا ہے۔

اسلام میں نکاح کی حقیقت

نکاح ایک انسانی ضرورت اور بقاءِ نسل کا ذریعہ ہے اس لیے شریعت نے اسے بہت آسان اور نہایت سستا بنایا ہے، چنانچہ نکاح کی حقیقت میں چھ باتیں شامل ہیں: دو فرائض: ایجاب وقبول اور دو گواہوں کا ہونا، ایک واجب: مہر (حسبِ استطاعت) اور تین سنتیں: خطبہ نکاح، تقسیمِ چھوہارہ اور حسبِ حیثیت ولیمہ۔ ان اعمال کے علاوہ شادی کے موقع پر جتنے بھی کام کیے جاتے ہیں وہ غیر شرعی اور خلافِ سنت ہیں۔ غور فرمائیں ایجاب وقبول، بوقت نکاح دو گواہوں کا ہونا، مہر ادا کرنا، خطبہ نکاح پڑھنا، چھوہارے تقسیم کرنا اور ولیمہ کرنا یہ سب اگرچہ نکاح کے لوازمات ہیں؛ لیکن ایسے بھی نہیں کہ جن میں کچھ زحمت اور دشواری ہو۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک جگہ لکھا ہے:

" ہر چیز میں کچھ نہ کچھ خرچ کی ضرورت ہے بجز نکاح کے کہ یہ اپنی حقیقت میں ایک پیسہ پر بھی موقوف نہیں ؛ کیوں کہ اس کی حقیقت ایجاب ہے وقبول ہے اور یہ محض دو بول ہیں زبان کے، ان میں کسی خرچ کی کیا ضرورت، چھوارے سو وہ محض مستحب ہیں، مہر میں موجل (ادھار) کی بھی گنجائش ہے، تو فرمایئے سب سے زیادہ سستی چیز اگر کوئی تھی تو نکاح تھا، مگر اللہ بھلا کرے ہمارے بھائیوں کا سب نے آپس میں کمیٹی کر کے اس کو ایسا مہنگا کر دیا اور رسم و رواج کی زنجیروں سے ایسا جکڑ دیا کہ غریب آدمی کی تو مصیبت ہے، امیروں کے لیے بھی زحمت ہے" (میلاد النبی)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

" دیکھو نماز روزہ وہ عبادتیں ہیں جن میں پیسہ لگتا ہے اور نکاح وہ عبادت ہے جو بغیر پیسہ کی ہے"

(بحوالہ دعوت حق ص:233 ج:اول)

سماج میں نکاح کی حقیقت

جب سماج میں نکاح کا ذکر کیا جاتا ہے تو نکاح کا سماجی تصور اتنا بھاری بھرکم اور اتنے لوازمات پر مشتمل ہوتا ہے کہ بس اللہ کی پناہ۔ منگنی کی رسم، مہندی کی رسم، ڈھول باجے کی ضرورت، مال کا اسراف، میرج ہال کی بکنگ، بارات کی گہما گہمی، مہنگے جہیز کے مطالبات، رات بھر جگنا، گھروں کو روشنی سے سجانا، تصویر اور ویڈیو گرافی کا التزام، بے پردگی، نمازوں کو بالائے طاق رکھ دینا اور نہ جانے کیسی کیسی بدعات وخرافات کا ارتکاب: یہ سب نکاح کے وہ مشمولات ہیں جن کا شریعت وسنت سے دور کا بھی واسطہ نہیں، لیکن سماج میں یہ سب رائج ہیں، اور نکاح جیسی اہم سنت کا غیر ضروری حصہ ہیں، لوگ شوق سے ان غیر شرعی امور کا ارتکاب کرتے ہیں، اور سب چلتا ہے کے غیر دینی اصول پر عمل کرنے میں ذرا بھی جھجھک محسوس نہیں کیا جاتا، اس معاملہ میں مردوں سے زیادہ عورتیں پیش پیش رہتی ہیں۔ ظاہر ہے جب عبدیت چھوڑ کر حیوانیت کے راستے پر انسان چلے گا تو برکت کے بجائے بے برکتی ہی اس کا مقدر بنے گی، اپنی بیجا شہرت کے حصول اور مخلوق کو خوش کرنے کی فکر کی وجہ سے آج ہماری شادی بیاہ سے سنت کی روشنی غائب ہوگئی ہے۔ بھوپال کے صاحبِ دل بزرگ مولانا محمد یعقوب صاحب مجددیؒ نے ایک بات بڑے درد وسوز سے کہی ہے:" شادیوں میں سب بلائے جاتے ہیں، صرف خدا اور رسول کو رخصت کر دیا جاتا ہے، صرف شادی کے اوقات میں وہ باہر رہتے ہیں، پھر ان سے راہ ورسم پیدا کر لی جاتی ہے"۔

(اسرار حیات: ص:173 بحوالہ صحبت با اہل دل)

اس موقع پر ہر شخص کو حضرت تھانویؒ کی کتاب اصلاح الرسوم کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، حضرت تھانوی نے منگنی کے رسوم کو قیامت صغریٰ قرار دیا ہے اور شادی کے بارے میں لکھتے ہیں: "منجملہ ان رسوم کے قیامت کبری کی رسم ہے جس کو عرف میں شادی کہتے ہیں اور واقعی بربادی کہنا لائق ہے۔ بربادی بھی کیسی، دنیا کی بھی اور دین کی بھی، اس کا لقب قیامت کبری رکھا گیا ہے۔ حضرت نے اس کے ذیل میں ایک سو رسوم کا تذکرہ فرمایا ہے، یعنی ایک سو رسمیں ایسی ہیں جو مسنون نکاح کو داغدار کیے ہوئے ہیں، لوگ انھیں نکاح کی حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں۔ حضرت نے ان ایک سو رسوم کے ذکر کے بعد لکھا ہے: "یہ ایک سو واقعات ہیں جن میں سے کسی میں ایک گناہ کسی میں دو گناہ کسی میں چار، پانچ اور بعض میں تیس تک مجتمع ہیں۔ اگر اوسط فی واقعہ تین گناہ رکھے جائیں تو واقعات مذکورہ تین سو گناہوں کا مجموعہ ہے۔ جس عقد میں تین سو حکم شرعی کی مخالفت ہوتی ہو، اس میں خیر و برکت کا کیا ذکر۔

غرض واقعات مذکورہ ان معاصی سے پر ہیں۔ اسراف، افتخار و نمائش، التزام مالا یلزم تشبہ بالکفار، سودی قرض یا بلاضرورت قرض لینا، جبر تبرعات، بے پردگی، شرک، فساد عقیدہ، نمازوں کا یا جماعت کا قضا ہونا، اعانتِ معصیت، اصرار و استحسان معاصی کا جن کی مذمت قرآن وحدیث میں صاف صاف مذکور ہے" (اصلاح الرسوم ص:86)

دین داری بنام مالداری

زوجین میں نکاح کے وقت سب سے زیادہ قابل توجہ چیز از روے شرع دینداری ہے اور سب سے کم قابل التفات مال اور حسن وجمال ہے، لیکن سماج میں معاملہ برعکس ہے: لڑکی میں زیادہ تر حسن وجمال اور لڑکے میں زیادہ تر مال کو دیکھا جاتا ہے، دینداری موضوعِ گفتگو نہیں ہوتی؛ چنانچہ اس زمانہ میں مال وجمال ہی انتخابِ رشتہ کا معیار ہیں، یہ معیار قابلِ اصلاح ہے، اسی واسطے حدیث میں لڑکی کے سلسلے میں یہ بات وضاحت سے منقول ہے کہ عورت سے چار وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے: شرافت کی وجہ سے، مال کی وجہ سے، خوبصورتی کی وجہ سے اور دینداری کی وجہ سے۔ اے مخاطب تجھ کو دیندار عورت سے نکاح کرنا چاہیے (مشکوٰۃ)۔ اور لڑکے کے بارے میں ارشاد ہے: اگر تمہارے پاس ایسا شخص آئے جس کے اخلاق اور دینداری کو تم پسند کرتے ہو تو تم اپنی لڑکی کا نکاح اس سے کر دو ورنہ زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیلے گا۔ (مشکوٰۃ)

مذکورہ بالا دونوں حدیثوں کی خلاف ورزی نے ہمارے معاشرے اور ازدواجی نظام کو تہس نہس کر دیا ہے، میاں بیوی میں باہم الفت ومحبت اور ذہنی توافق نکاح کا مقصد اعظم ہے، اس مقصد کا حصول دین پر موقوف ہے، جن لوگوں نے دینداری کو پسِ پشت ڈال دیا ہے ان کی زندگیاں عموماً پیار ومحبت اور ازدواجی چین وسکون

سے خالی ہیں، دینداری کے بغیر صرف مال اور حسن و جمال بقاءِ محبت کے لئے کافی نہیں ہیں، بقول حضرت تھانوی کے: " مال و جمال کی عمر بہت ہی کم ہے، مال تو ایک شب میں بے وفائی کر جاتا ہے اور جمال ایک بیماری میں ختم ہو جاتا ہے" ۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مال اور حسن و جمال بوقت نکاح کوئی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ دینداری کے ساتھ یہ جمع ہو جائیں تو ایسا رشتہ نور علیٰ نور کا مصداق ہوگا۔

دینداری کا معیار

شریعت میں اس علم کا سیکھنا اور سکھانا ایمان کا شعبہ اور عبادت کا حصہ ہے جو اللہ کی ذات وصفات کی یا اس کے احکام کی معرفت کا ذریعہ ہو، رشتہ نکاح میں عورتوں میں اسی دینی تعلیم کا ڈھونڈنا ضروری ہے، اسی علم سے انسان مہذب اور دیندار بنتا ہے، کیونکہ دینی تعلیم ہی تمام علوم و تہذیب کی اساس ہے، اور اسی سے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوتا ہے: وہی خوف (تقویٰ) جس کی یاد دہانی خطبہ نکاح کے موقع پر بار بار کرائی جاتی ہے۔اس معاملہ میں بھی ہمارا سماج اپنی الگ رائے اور جدا معیار رکھتا ہے، چنانچہ اب زیادہ تر لڑکی کی ڈگریاں دیکھی جاتی ہیں اور اسی کی بنیاد پر رشتے ہوتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سارے حقوق ضائع ہونے لگے جو شریعت نے زوجین پر عائد کیے ہیں، سکونِ دل کے ساتھ سکونِ خانہ بھی غارت ہو گیا، اس لیے نکاح کے وقت اس معاملہ میں بہت توجہ درکار ہے۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ لڑکیوں کو عصری علوم کی تعلیم نہ دی جائے بلکہ گزارش یہ ہے کہ دینی علوم ہماری ترجیحات کا حصہ ہونا چاہیے، جو علوم وفنون شریعت کی طرف سے ممنوع نہیں ہیں نیز وہ اللہ کی معرفت اور عبادت میں مُخِل اور حارج نہیں ہیں یا وہ علوم خلقِ خدا کی نفع رسانی کا ذریعہ ہیں تو انھیں ضرور سیکھنا چاہیے بلکہ حسن نیت سے ان میں عبادت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔اس موقع پر حضرت تھانوی کی ایک دوسری اہم کتاب " اصلاح انقلابِ امت " حصہ دوم کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

مسجد بنام شادی خانہ

نکاح کرنے کے لیے سب سے عمدہ اور مقدس جگہ مسجد ہے، اس کے لیے جمعہ کا دن بہتر ہے؛ لیکن آج کل نکاح کے لیے شادی خانے کی بُکنگ ہوتی ہے، دن تاریخ رکھنے میں مبارک اور منحوس کی خودساختہ شناخت ہوتی ہے۔یہ اسلامی مزاج کے خلاف ہے نیز خلاف سنت ہونے کی وجہ سے بے برکتی کا ذریعہ ہے۔نکاح ایک عبادت ہے، مسجدیں عبادت خانہ ہیں، عبادت اگر عبادت خانے میں انجام پائے تو وہ کتنی سعادتوں اور برکتوں کا پیش خیمہ ہوگی ہم آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے ۔اسی طرح جمعہ حدیث کے بموجب دنوں کا سردار اور خوشی کا دن ہے، نکاح عبادت ہونے کے ساتھ خوشی اور شادمانی کا موقع بھی ہے، اگر خوشی، خوشی کے موقع میں انجام پائے تو

مسرت پائے دار ہوتی ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی تحقیق یہ ہے کہ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت نکاح کے لیے سب سے بہتر ہے؛ کیونکہ یہ دعا کی قبولیت کی گھڑی ہے، اس اعتبار سے اگر ایسی مستجاب اور مقبول گھڑی کے اندر نکاح کیا جائے تو خیر و برکت کے اعتبار سے وہ نکاح ایک مثالی نکاح کا مصداق ہوگا؛ لیکن آج دیر رات نکاح کرنے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے جو یقینا قابل اصلاح پہلو ہے۔

علماء سے دوری کب تک؟

علماء کرام انبیاء کے وارث اور دین کے رہنماء ہیں، عوام کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی عبادات اور اپنے معاملات میں ان سے رجوع ہوں، اس کے بغیر وہ راہِ مستقیم پر گامزن نہیں ہوسکتے، مقامِ ستم ہے کہ لوگ اپنے دنیاوی معاملات میں ماہرین سے نہ صرف یہ کہ رابطہ کرتے ہیں؛ بلکہ ان کے بتائے ہوئے نقوش وخطوط پر چلنا ضروری خیال کرتے ہیں، لیکن جب دین کا مسئلہ آتا ہے تو اہلِ ذکر اور ماہرینِ دین سے رابطہ غیر ضروری سمجھتے ہیں، کیا آپ نے کبھی سنا یا دیکھا ہے کہ فلاں شخص نے نکاح سے پہلے کسی مفتی یا عالم دین سے اس لیے رابطہ کیا ہو کہ وہ مفتی یا عالم نکاح کا جو مسنون طریقہ بتائے گا وہ بس اسی پر عمل کرے گا؟ آخر ہم دنیا کے معاملات میں اتنے چوکنے اور دین کے معاملات میں اس قدر بے خبر کیوں ہیں؟ کیا ہم نہیں جانتے کہ آخرت دنیا سے بہتر اور زیادہ پائے دار ہے۔؟ یقینا ہمیں اس کا علم ہے، آیئے ہمت کریں اور علماء سے پوچھ کر شادی بیاہ کے معاملات انجام دینے کا عزم کریں۔

اصلاحی مضامین

ہماری نمازیں بے اثر کیوں؟

نماز میں چار مقامات زیادہ اہم ہیں۔

۱) نماز کی حاضری لگوانا۔ ۲) نماز کو اللہ تعالیٰ کے ہاں جمع کروانا۔

۳) سلامتی رحمت اور برکت کا حقدار بننا۔ ۴) دعاء کا قبول کرانا۔

(۱) تکبیر تحریمہ کے بعد پہلا کام نماز کی حاضری لگوانا ہے کیوں کہ ملازم کو بغیر حاضری لگائے تنخواہ نہیں ملتی، پوری نماز میں اگر ذہن دنیا میں کھویا رہا اللہ کی یاد ہی نہیں آئی تو یہ نماز کس کھاتہ میں شمار ہوگی، اس لئے فوراً یہ نیت کرلیں کہ میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں یا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے۔

(۲) اگر آپ نے تشہد میں دھیان اور توجہ سے ترجمہ ذہن میں رکھ کر التحیات للہ والصلوات والطیبات کہہ دیا تو اس نماز کا اجر اللہ تعالیٰ کے پاس آپ کے کھاتہ میں جمع ہوگیا اگر آپ نے دنیا کے خیالات میں التحیات پڑھ دی تو نماز کا مقصد فوت ہوگیا، نماز دل میں پڑھنا بھی منع ہے اتنا زور سے پڑھیں کہ خود سن سکیں اسی طرح نماز میں غیر ضروری حرکت کرنا ہلتے رہنا یا بار بار کپڑوں کو صحیح کرنا نماز کے اجر کو کم کر دیتا ہے۔

(۳) جب آپ نے نبی علیہ السلام پر سلام رحمت اور برکت بھیجی یعنی السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ نیت سے کہا تو فرشتے کی دعاء سے آپ خود بھی ان تینوں چیزوں کے حقدار بن گئے بس توجہ شرط ہے، مگر شیطان آپ سے یہ جملے بلا سوچے سمجھے فرفر کہلوانے کی کوشش کرے گا تا کہ آپ بلاؤں اور بیماریوں میں گھرے رہیں، سلامتی رحمت اور برکت سے محروم رہیں۔ اپنے اوپر سلام بھیجنا بھی مت بھولیں السلام علینا توجہ سے پڑھیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کی ایک اور نعمت عظمی سے بھی باخبر ہیں وہ ہے دنیا میں ہر نماز پڑھنے والے کی طرف سے آپ کو سلام پہنچتا، اگر آپ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرتے ہیں اور گناہ کی صورت میں (چوبیس گھنٹے کے اندر) معافی مانگ لیتے ہیں تو آپ کا شمار عباد اللہ الصالحین میں ہوگا پھر آپ ہر نمازی کے سلام کے حقدار ہیں اور خود بھی توجہ سے یہ جملہ پڑھ کر صالحین کو سلام بھیجا کریں۔ (بقیہ صفحہ ۲۴ پر)

اصلاحی مضامین

قسط (۱)

استغفار کے فوائد وثمرات؛ قرآن مجید کی روشنی میں

ازقلم: مفتی احمد عبیداللہ یاسر قاسمی*

استغفار کا معنیٰ ہے: مغفرت طلب کرنا، یعنی جب انسان سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوجائے اور انسان اس پرنادم ہوکہ میں نے اپنے خالق و مالک کی نافرمانی کی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا تو شرع میں اس کو استغفار کہتے ہیں، استغفار کے قرآن مجید میں بے شمار فوائد ہیں، حضرت حسن بصریؒ سے ایک شخص نے بارش نہ ہونے کی شکایت کی، تو آپ نے اس شخص سے فرمایا: استغفار کرو، ایک دوسرے شخص نے بھی نے تنگدستی کی شکایت کی، تو اس کو بھی فرمایا کہ: استغفار کرو، ایک تیسرے آدمی نے اولاد نہ ہونے کی شکایت کی، تو اس کو بھی فرمایا کہ: استغفار کرو، چوتھے نے شکایت کی کہ پیداوار زمین میں کمی ہے، تو اس کو بھی فرمایا کہ: استغفار کرو، پس لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے ہر شکایت کا ایک ہی علاج تجویز فرمایا؟ تو انہوں یہ آیت تلاوت فرمائی: اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ "(سورۂ نوح)

ترجمہ: "چنانچہ میں نے کہا کہ: اپنے پروردگار سے مغفرت مانگو، یقین جانو وہ بہت بخشنے والا ہے، وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، اور تمہارے مال اور اولاد میں ترقی دے گا، اور تمہارے لیے باغات پیدا کرے گا، اور تمہاری خاطر نہریں مہیا کردے گا۔"

(ماخوذ از: معارف القرآن کاندھلوی تفسیر سورۂ نوح)

اگر اس واقعہ میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا ان چاروں شخصوں کو جو حاجت درپیش تھی استغفار میں اسکا حل موجود تھا ان آیات کریمہ میں دراصل استغفار کے چھ قرآنی فوائد موجود ہیں:

(1) استغفار کرنے والوں کی دعاؤں کا قبول ہونا:

اس آیت کی تفسیر میں امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: فرمانِ باری تعالیٰ: "فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ "

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

یعنی: تم اللہ سے اپنے سابقہ گناہوں کی بخشش کا سوال اخلاص اور ایمان کیساتھ کرو۔ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا یعنی: وہ ہمیشہ توبہ کرنے والوں کو معاف کرتا ہے، ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ بندوں کو توبہ کرنے کے لئے ترغیب دلا رہا ہے۔

(2) آسمان سے نفع بخش بارش

يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا استغفار کا دوسرا فائدہ یہ ہے اللہ تعالیٰ آسمان سے نفع بخش بارش برساتے ہیں، بارش اللہ تعالی کی بہت بڑی نعمت ہے اور یہ نعمت استغفار سے حاصل ہوتی ہے، بارش ہی اس روئے زمین پر پانی کا اصل مصدر ہے، غور کیجئے کہ بارش نہ ہو اور متواتر دھوپ ہی دھوپ رہے تو پانی کی تہ نیچے چلی جاتی ہے، چشمے، کنویں، نہریں اور دریا خشک ہو جاتے ہیں، ہوا میں نا قابل برداشت گرمی پیدا ہو جاتی ہے، غلے اور پھلوں کی پیدائش بند ہو جاتی ہے، درخت اور کھیتیاں سوکھ جاتی ہے حتی کہ جسم انسانی بھی سوکھ جاتا ہے اور قسم قسم کے امراض اہل زمین کو گھیر لیتے ہیں، جس کی وجہ سے زندگی گذارنا مشکل بن جاتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اگر زمیں پر متواتر (لگاتار) بارش ہی ہوتی رہے اور دھوپ دکھائی نہ دے تو زمین پر سیلاب آجائے، کھیتیاں برباد ہو جائیں، میوے اور پھل خراب ہو جائیں، سبزیوں اور سبزہ زاروں پر سڑان پیدا ہو جائے، آمد ورفت کا سلسلہ منقطع ہو جائے، کاروبار ٹھپ پڑ جائے حتی کہ جسم انسانی ڈھیلے پڑ جائیں اور مختلف قسم کے امراض اہل دنیا کو گھیر لیں ان سب بلاؤں سے حفاظت استغفار کے ذریعے ہوتی ہے چنانچہ ایک بار حضرت عمرؓ لوگوں کو لے کر بارش کے لیے شہر سے باہر نکلے لیکن صرف استغفار کے بعد لوٹ آئے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا (یعنی نماز نہیں پڑھی) عرض کیا گیا: ہم نے سنا تھا کہ آپ بارش کی دعا کریں گے (مگر آپ نے صرف استغفار پر اکتفاء کیا) فرمایا: میں نے بارش کی دعا ان سرچشموں (یا راستوں) سے کی جن سے آسمان کی بارش ہوتی ہے۔ اس کے بعد آپ نے آیت: اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا تلاوت کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قحط سالی اور دیگر عمومی عذابات سے بچنے کا ذریعہ استغفار ہے۔

(3) مال و دولت میں اضافہ

استغفار کا تیسرا فائدہ یہ ہے اللہ تعالیٰ اس سے مال و دولت میں اضافہ فرماتے ہیں مال کمانا فی نفسہ برا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے مال کو خیر اور دنیا میں قیام و بقا کا ذریعہ قرار دیا ہے، اسلام نہ انسانوں کو رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے نہ ہی ترک دنیا و ترک خواہش کو اچھا سمجھتا ہے اور نہ مال کو خزانوں کی طرح جمع کرنے اور ضرورت مندوں پر خرچ نہ کرنے کی تعلیم دیتا ہے بلکہ حلال وحرام میں تمیز کرتے ہوئے اور اس طرح مالِ خیر میں اضافہ کا سبب قرآن مجید کی رو سے استغفار ہے۔

(4) آل واولاد میں اضافہ

استغفار کا چوتھا فائدہ یہ ہے اللہ تعالیٰ اس سے آل واولاد میں اضافہ فرماتے ہیں اسلام میں کثرت اولاد مستحسن ہے بلکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کثرتِ اولاد کی ترغیب دی ہے کہ خوب بچہ جننے کی صلاحیت رکھنے والی خواتین سے شادی کرو، اس لیے کہ میں تمہاری کثرت کے ذریعہ تمام امتوں پر (روزِ قیامت) فخر کروں گا" تزوجوا الودود الولود؛ فإني مكاثر بكم الأمم" اور اولاد میں اضافہ کا ایک سبب قرآن کثرت استغفار قرار دیتا ہے۔

(5) باغات بنوائے جائیں گے۔(6) نہریں جاری کی جائیں گی

مفسرین کرام اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ دراصل یہ آیت مبارکہ کی مخاطب حضرت نوح کی قوم تھی اس لیے کہ ان کی نافرمانیوں کے سبب اللہ تعالی نے ان کو قحط سالی میں مبتلا کر دیا تھا اب ان سے استغفار کرنے پر یہ کہا جا رہا تھا کہ استغفار سے حسب معمول تمہاری کھیتیاں سرسبز وشاداب کر دی جائے گی اور تمہاری ندیوں میں دوبارہ پانی آجائے گا جس سے تم نفع اٹھا سکو گے، اس کے علاوہ یہ بھی بعید نہیں کہ استغفار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ان کے استغفار کے سبب جنت میں باغات بنا کر عطا فرمائیں اور جنت کی چار نہروں سے ان کو مالا مال کر دیں۔

(7) استغفار سے گناہ معاف ہوتے ہیں

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴿۱۱۰﴾ جو شخص کوئی برائی کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے استغفار کرے تو وہ اللہ کو بخشنے والا مہربانی کرنے والا پائے گا'' (سورہ نساء: ۱۱۰) اس آیت کریمہ کی تفسیر میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں: وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا جو شخص کوئی بدی کرے یعنی ایسا برا کام کرے جس سے دوسرے کو تکلیف ہو یا اپنے اوپر ظلم کرے یعنی ایسی برائی جس سے دوسرے کو ضرر نہ پہنچتا ہو صرف اپنے کو نقصان پہنچتا ہو پھر اللہ سے معافی کا طلب گار ہو یعنی اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے اور لوگوں کے حقوق لوٹا دے وہ اللہ کو گناہ بخشنے والا، اور مہربان پائے گا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: جب آیت مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا نازل ہوئی تو (غم کے مارے) ہمارے کھانے پینے کا فائدہ جاتا رہا' آخر آیت ''وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا'' نازل ہوئی۔ متعدد طریقوں سے حضرت علیؓ کی روایت سے حضرت ابوبکرؓ کا بیان آیا ہے کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے: جس شخص نے کوئی گناہ کر لیا ہو پھر اٹھ کر اچھی

طرح وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے اور گناہ کی بخشش کا خواستگار ہو تو اللہ ضرور ہی معاف فرما دیتا ہے کیونکہ اس نے خود فرمایا ہے: وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ''

(رواہ ابن ابی حاتم وابن السنی وابن مردویہ) (بہ حوالہ تفسیر مظہری سورہ نساء آیت نمبر 110)

(8) استغفار سامانِ زندگی کا سبب ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ اور یہ (ہدایت دیتا) کہ: اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی مانگو، پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ وہ تمہیں ایک مقرر وقت تک (زندگی سے) اچھا لطف اٹھانے کا موقع دے گا، اور ہر اس شخص کو جس نے زیادہ عمل کیا ہوگا، اپنی طرف سے زیادہ اجر دے گا۔ اور اگر تم نے منہ موڑا تو مجھے تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔

یہ بات تو طئے ہے کہ انسان کے گناہوں سے مصائب اور بلائیں آتی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ جو مصیبت تم پر آتی ہے اپنے کرتوت کی وجہ سے آتی ہے اور اللہ بہت سے جرائم سے تو درگذر فرما دیتا ہے (پھر بھی بعض گناہوں کی پاداش میں تم پر مصائب آ ہی جاتے ہیں) تو اس کے لیے استغفار اور توبہ کا حکم دیا گیا کہ اپنے رب سے مغفرت اور معافی مانگا کریں اور توبہ کیا کریں، مغفرت کا تعلق پچھلے گناہوں سے ہے اور توبہ کا تعلق آئندہ ان کے پاس نہ جانے کے عہد سے ہے، اور درحقیقت صحیح توبہ یہی ہے کہ پچھلے گناہوں پر نادم ہو کر اللہ تعالیٰ سے ان کی معافی طلب کرے اور آئندہ ان کے نہ کرنے کا پختہ عزم و ارادہ کرے۔

مفسرِ اعظم حضرت مفتی شفیع عثمانی ؒ صاحب لکھتے ہیں: کہ آیت مذکور میں ''متاع حسن'' کی تفسیر اکثر مفسرین نے یہ کی ہے کہ استغفار و توبہ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ تم کو رزق کی وسعت اور عیش کی سہولتیں عطا فرمائے گا اور آفتوں اور عذابوں سے تمہاری حفاظت کرے گا۔۔۔ اور حضرت سہل بن عبداللہ نے فرمایا کہ متاع حسن سے مراد یہ ہے کہ انسان کی توجہ مخلوق سے ہٹ کر خالق پر جم جائے، اور بعض بزرگوں نے فرمایا کہ متاع حسن یہ ہے کہ انسان موجود پر قناعت کرے، مفقود کے غم میں نہ پڑے یعنی دنیا جس قدر میسر ہو اس پر مطمئن ہو جائے جو حاصل نہیں اس کے غم میں نہ پڑے۔ دوسری خوشخبری توبہ و استغفار کرنے والوں کو یہ دی گئی کہ وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ، اس میں پہلے فضل سے مراد انسان کا عمل صالح اور دوسری فضل سے فضل خداوندی یعنی جنت ہے، مطلب یہ ہے کہ ہر نیک عمل والے کو اللہ تعالیٰ اپنا فضل یعنی جنت عطا فرماویں گے یعنی پہلے جملہ میں اللہ تعالیٰ نے

دنیا و آخرت دونوں میں متاع حسن یعنی اچھی زندگی کا اور دوسرے جملہ میں جنت کی لازوال نعمتوں سے مالا مال کرنے وعدہ فرمایا۔(بحوالہ معارف القرآن از مفتی شفیع عثمانی صاحبؒ)

(9) استغفار ہر طرح کی طاقت وقوت کی زیادتی کا ذریعہ ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے:وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ﴿۵۲﴾ ’’اور اے میری قوم! اپنے رب سے مغفرت طلب کرو۔یعنی سابق شرک اور گناہ کرنے کی معافی مانگو۔مطلب یہ ہے کہ ایمان لے آؤ، مسلم ہو جاؤ۔ پھر (شرک کو چھوڑ کر اور خالص توحید کے ساتھ مطیع بن کر) اس کی طرف لوٹو،تو وہ خوب بارشیں تم پر برسائے گا اور تمہاری (موجودہ) قوت میں مزید ترقی دے گا‘‘۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں قاضی ثناءاللہ پانی پتیؒ لکھتے ہیں:قوم عاد تین سالہ کال میں مبتلا ہوگئی تھی۔تین سال سے بارش نہیں ہوئی تھی اور عورتیں بھی بانجھ ہوگئی تھیں، کسی کے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔حضرت ہود نے فرمایا:اللہ سے استغفار اور توبہ کرو وہی پانی برسائے گا جس سے تمہاری مالی ترقی ہوگی اور وہی عورتوں کا بانجھ پن دور کرے گا اور بچے پیدا ہونے لگیں گے۔اس طرح تم کو مال و اولاد کی مزید طاقت حاصل ہو جائے گی،بعض نے قوت سے مراد بدنی طاقت لی ہے،یعنی اللہ تمہاری جسمانی طاقت بڑھا دے گا۔جاری...

مصافحہ اور معانقہ کے آداب

۱۔مصافحہ دونوں ہاتھ سے کرے۔

۲۔مصافحہ کے ساتھ سلام بھی کرے۔

۳۔مصافحہ اور سلام کے وقت جھکنا منع ہے۔

۴۔اگر مصافحہ سے دوسرے کو تکلیف ہو جیسے ہجوم میں علماء کو مصافحہ کرنا یا بیمار اور نازک مزاج کو مصافحہ کرنا ہو تو صرف سلام پر اکتفا کرے۔

۵۔معانقہ اور مصافحہ میں جسم کو اس طرح نہ دبائے جس سے تکلیف ہو۔

۶۔جو آدمی جلدی میں آئے مصافحہ معانقہ نہ کرے۔

۷۔جہاں لوگ پڑھنے لکھنے میں مصروف ہوں وہاں صرف سلام پر اکتفا کرے۔

نقد و تحقیق

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سے منسوب نعتیہ کلام کی تحقیق

مولانا عبدالصمد ساجد

اللہ تعالی نے حجۃ الاسلام، بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کو ایک جلیل القدر عالم، عظیم داعی اور بے باک مناظر کے ساتھ ساتھ فطری شاعر بھی بنایا تھا، بچپن ہی میں آپ کو یہ دولت ودیعت کردی گئی تھی، جیسا کہ سوانح قاسمی شاہد ہے کہ مولانا لڑکپن ہی سے فطری شاعر تھے، طبع آزمائی اور فکر وفن سے دلچسپی رکھتے تھے، مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بہ قول: اپنے کھیل اور بعض قصوں کو نظم فرماتے اور لکھ لیتے۔
(سوانح قاسمی، ج:۱،ص:۲۶۷)

مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو آپ کے سرپرست اور استاذ تھے، شعر و سخن پر قدرت رکھتے تھے اور مفتی صدرالدین صاحب آزردہ جن سے آپ نے ادب کی کتابیں پڑھی تھی، وہ غالب کے معاصر اور اردو کے نقاد تھے۔آپ کے شعروں میں جو گداز وتاثیر اور جو کیفیت وانشراح ہے وہ قدیم اور کلاسیکی ادبی سرمایہ سے مکمل آگہی کا نتیجہ ہے حضرت کے مختلف کلام قصائد قاسمی وغیرہ کتب میں درج ہیں۔

جب سے ہوش سنبھالا ایک نعتیہ کلام حجۃ الاسلام، قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ (بانی دارالعلوم دیوبند) کی طرف منسوب سنتے اور پڑھتے آئے، کلام درج ذیل ہے:

سب سے پہلے مشیت کے انوار سے نقش روئے محمد بنایا گیا
پھر اسی نقش سے مانگ کر روشنی بزم کون و مکاں کو سجایا گیا
وہ محمد بھی احمد بھی محمود بھی حسنِ مطلق کا شاہد بھی مشہود بھی
علم وحکمت میں وہ غیر محدود بھی ظاہراً امیوں میں اٹھایا گیا
اس کی شفقت ہے بے حد و بے انتہا اس کی رحمت تخیل سے بھی ماورا
جو بھی عالم جہاں میں بنایا گیا اس کی رحمت سے اس کو بسایا گیا
کس لیے حشر کا ڈر ہو قاسم مجھے میرا آقا ہے وہ میرا مولا ہے وہ
جس کے قدموں میں جنت بسائی گئی جس کے ہاتھوں سے کوثر لٹایا گیا

نہ صرف عوامی نعت گو حضرات کو اسے قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ کی طرف منسوب کرتے پایا؛ بلکہ بعض اہل علم شخصیات نے بھی اس کلام کی نسبت حضرت نانوتوی رحمہ اللہ ہی کی طرف کردی۔

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کے شاگرد رشید، ڈابھیل کے فاضل حضرت مولانا مجاہد الحسینی رحمہ اللہ (۱۹۲۶ء۔ ۲۰۱۹ء) نے اپنی کتاب "علماء دیوبند، عہد ساز شخصیات (مطبوعہ سیرت مرکز، فیصل آباد، ۲۰۰۴) کے ص: ۲۰۴ پر حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ کے حوالے سے یہ نعت نقل فرمائی ہے، مکتبہ رشید سے کراچی سے چھپنے والے سالانہ مجلہ یادگار اکابر کے حجۃ الاسلام نانوتوی نمبر (ص: ۳۳، ۱۴۳۶ھ/ ۲۰۱۵ء) میں بھی یہ کلام حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے نام سے شائع ہوا ہے نیز معروف عالم اور خطیب مولانا ضیاء الرحمن فاروقی رحمہ اللہ نے بھی اپنی بعض تقاریر میں اس کو حضرت نانوتویؒ کی طرف نسبت کرتے ہوئے پڑھا ہے۔

چند روز قبل ہمارے نہایت محسن اور کرم فرما دوست منصور الحق سلمہ (جو غیر عالم ہونے کے باوجود ذوقِ مطالعہ وشوقِ کتب بینی میں اپنی مثال آپ ہیں۔) نے باحوالہ یہ انکشاف کیا کہ یہ کلام حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کا ہے ہی نہیں، بلکہ مشہور شاعر پروفیسر کرم حیدری کا ہے جو ان کے کلام کی کتاب ''نِعَمْ'' کے ص ۳۹ پر موجود ہے، جسے تاج کمپنی لاہور پاکستان نے ۱۴۰۰ھ میں شائع کیا ہے اور اس میں آخری شعر یوں ہے:

حشر کا غم مجھے کس لیے ہو کرم میرا آقا ہے وہ میرا مولیٰ ہے وہ
جس کے دامن میں جنت بسائی گئی جس کے ہاتھوں سے کوثر لٹایا گیا

اس کے مزید کچھ اشعار بھی ہیں جو عام طور پر پڑھے نہیں جاتے، کرم حیدری اردو اور پنجابی کے شاعر تھے، اصل نام محمد کرم داد اور والد کا نام ملک حکیم داد تھا، پیدائش ۱۲/اگست ۱۹۱۵ء، راولپنڈی پاکستان میں ہوئی، متعدد تصانیف سپرد قلم کیں، ۳۱/جنوری ۱۹۹۴ء اسلام آباد پاکستان میں وفات ہوئی۔

ظاہر ہے کہ حضرت مولانا مجاہد الحسینی رحمہ اللہ تعالیٰ و دیگر حضرات نے اس کلام کو حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی کی طرف جو منسوب کیا ہے وہ تسامح ہے، جس کی وجہ تسامح اور عمومی شہرت تھی، بر ایں بنا یہ حضرات بجا طور پر معذور ہیں۔ ویب سائٹ اردو ویب پر اٹک کے شاعر جناب سید شاکر القادری تبصرہ کرتے ہیں کہ:

"مولانا قاسم نانوتوی قادر الکلام شاعر تھے وہ اتنا بے وزن مقطع تو نہیں کہہ سکتے، لگتا ہے کسی عقیدت مند نے ان کا نام منقطع میں فٹ کر دیا ہے، ورنہ ہم نے تو اس مقطع کو یوں سنا ہے:

''حشر کا غم مجھے کس لیے ہو کرم، میرا آقا ہے وہ میرا مولا ہے وہ''

اس میں قاسم کی بجائے کرم تخلّص ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ کرم حیدری کی نعت ہو اور اگر مولانا کی نعت ہے تو ان کی کونسی کتاب یا رسالے سے نقل کی گئی ہے۔ (شاکر القادری کی بات ختم ہوئی)

سید شاکر القادری کا اصل نام سید ابرار حسین گیلانی ہے، یہ اردو، فارسی اور پشتو پر یکساں مہارت رکھتے ہیں اور اردو اور فارسی کے خوش گو شاعر ہیں۔

نیز بہ نظر غائر دیکھا جائے حضرت نانوتوی کے کلام اور طرز و اسلوب سے یہ کلام کسی طرح مناسبت وموافقت نہیں رکھتا، ہمارے ایک عالم مولانا عبد الجبار سلفی زید مجدو فرماتے ہیں کہ:

مدت گزری کہ ایک مرتبہ ہم سلطان العلماء علامہ ڈاکٹر خالد محمود رحمہ اللہ کے ساتھ ایک اسٹیج پہ بیٹھے ہوئے تھے ایک خطیب صاحب نے اپنی تقریر میں جب یہی اشعار امام نانوتوی علیہ الرحمۃ سے منسوب کر کے پڑھے تو علامہ صاحب نے مخصوص انداز میں ہمارے کان میں فرمایا: ”یہ اردو بھلا اس زمانے کی ہے؟“

عہد حاضر کے عظیم مؤرخ ومحقق مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی سے اس کلام کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بھی حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی طرف اس کی نسبت مشکوک قرار دی۔

اس کلام کے بعض مصرعوں پر نظریاتی حوالے سے بھی کلام ہوسکتا ہے، بندہ نے اپنے استاذ گرامی قدر مولانا مفتی سید عبد القدوس ترمذی (رئیس دار الافتاء جامعہ حقانی ساہیوال، سرگودھا) سے اس کلام کی بابت استفسار کیا تو فرمایا: لگتا یہ ہے کہ یہ حضرت کا کلام نہیں ہے ایسے ہی کسی نے ادھر منسوب کر دیا ہے، اس کلام کے بعض مصرعے بھی لفظی اور معنوی اعتبار سے محل نظر ہیں۔

بہر حال تجوز وتوسع سے کام لیتے ہوئے کلام میں اگر کوئی تاویل بھی کر لی جائے تو اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ کلام حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کا ہے، بلکہ دلائل وقرائن سے اس کی نفی ہوتی ہے۔

الحاصل! اس کلام کی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت نہ صرف مشکوک بلکہ غلط ہے، اس لیے ریکارڈ میں اس کی درستی ضروری ہے۔ (بہ شکریہ ماہنامہ الحقانیہ)

افاداتِ اکابر

بزرگوں کی صحبت سے بے نیازی

زمانے کا شدید فتنہ اور انسان کے لیے مہلک!

ترتیب وپیشکش: حضرت مولانا مفتی محمد ارشد صاحب مدظلہٗ *

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کا مولانا عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ کو ایک خصوصی مکتوب

جناب کا یہ ارشاد کہ ”طویل ملفوظات چھپے ہوئے بھی دیکھے جاسکتے ہیں“ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا، **میرے نقطۂ خیال سے مقصود تو زیارت اور ملفوظات دونوں نہیں؛ بلکہ اصل مقصود صحبت ہے۔**

اہل اللہ کی صحبت اعمال کی پختگی، دین کی صلابت، ایمان کی حرارت وغیرہ میں ایک مستقل حیثیت اور اہمیت رکھتی ہے، جس کی نظیر صحابۂ کرامؓ کا حضور کی خدمت میں حاضر رہنا ہے، **مشبہ اور مشبہ بہ میں گو فرق زمین و آسمان سے بھی زائد کا ہو؛ لیکن نوع بہر حال ایک ہے، اس کے لیے اہمیت نہ ملفوظات کی ہے، نہ خلوت کی۔** میں اصرار نہیں کرتا، آپ خود ہی اپنے قلب سے استفتاء کرلیں، استفت قلبك ولو أفتاك المفتون۔

تفسیر بیان القرآن کے اوصاف جو آپ نے بیان فرمائے، بالکل صحیح ہیں، مجھے بھی بسا اوقات اس کی زیارت کی نوبت آتی رہتی ہے، لیکن اس میں مشغول رہنا تو انتفاع مولانا کے علوم سے ہوا، مولانا کی ذات یا قرب سے نہ ہوا، **قرب مجلسی میں آخر کوئی چیز تو ہے جس کی طرف** وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ مَعَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ الخ میں اشارہ ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس آیت پر یہ ارشاد کہ الحمد لله الذي جعل في أمتي من اَمرنی ان اصبر معهم اور جب حضور کا یہ عمل چھوٹوں اور امتیوں کے ساتھ ہو، تو اس کے عکس کو خیال فرمالیں۔

زمانے کے شدید فتنوں میں سے ایک فتنہ صحبت صالحین سے بے نیازی کا ہے، کتابوں سے اس میں شبہ نہیں کہ معلومات بہت سے حاصل ہوجاتے ہیں، لیکن زندہ شخصیت کی تاثیر ہی کچھ اور ہے، پیر پرستی کی منزل سے یقیناً بچنا چاہیے، **لیکن بزرگوں کی صحبت سے بے نیازی بھی کچھ کم مہلک نہیں، اور عجب نخوت، خودرائی و خود پسندی کا بت تو بغیر اس کے ٹوٹتا ہی نہیں۔** (ماخوذ و مقتبس از: ”حکیم الامت نقوش وتاثرات“)

---

* مہتمم مدرسہ جامعۃ الابرار بجھیڑی، مظفر نگر، یوپی

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مفتی ندیم الدین قاسمی*

قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ لینا

سوال: قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ لینا کیسا ہے؟

جواب: قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ لینا جائز ہے۔ (کتاب المسائل، ۲/۴۴۰)

قربانی کی کھال مدرسہ کو دینا

سوال: قربانی کی کھال مدارس میں دینا کیسا ہے؟

جواب: قربانی کی کھال مدارس کے نادار طلبہ کو بطور صدقہ دینا درست ہے، اس میں صدقہ اور اشاعت دین دونوں کا ثواب ملنے کی امید ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ، ۱۷/۴۶۲)

قربانی کی جانور میں شرکاء کی تعداد

سوال: ایک جانور میں کتنے افراد شریک ہو سکتے ہیں؟

جواب: اگر قربانی کا جانور بکرا، بکری، بھیڑ یا دنبہ ہو تو ایک آدمی کی طرف سے کفایت کرے گا۔ (اعلاء السنن بہ حوالہ: قربانی کے احکام و مسائل، ۱۴) اور اگر قربانی کا جانور اونٹ، گائے، بیل یا بھینس ہوں تو ان میں سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں۔ (صحیح مسلم، بہ حوالہ سابق)

جو جانور ایک آنکھ سے نہیں دیکھتا اس کی قربانی

سوال: ایک جانور قربانی کے لئے خریدا وہ ایک آنکھ سے دیکھتا نہیں ہے، تو اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جس جانور کی ایک آنکھ خراب ہو گئی، اس سے وہ دیکھتا ہی نہیں، بلکہ صرف ایک آنکھ سے دیکھتا ہے تو ایسے جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ قاسمیہ 22/425)

---

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

جس جانور کے پیدائشی طور پر سینگ نہ ہوں

سوال: جس جانور کے سینگ قدرتی طور پر نہیں ہیں، تو کیا ایسے جانور کی قربانی جائز ہے؟

جواب: جس جانور کے پیدائشی طور پر سینگ نہ ہوں اس کی قربانی درست ہے۔(فتاویٰ قاسمیہ:20/441)

اسکوٹر سے ٹکر کھا کر جانور کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تو کیا ایسے جانور کی قربانی درست ہے؟

سوال: کسی نے قربانی کے لیے ایک بکرا خریدا، اتفاق سے کسی کی اسکوٹر سے ٹکر کھا کر اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تو اب اس کی قربانی کا کیا حکم ہے؟

جواب: ٹانگ اگر حادثے میں اس قدر ٹوٹ گئی کہ بکرا صرف تین ٹانگوں سے چلتا ہے اور چوتھا پیر زمین پر رکھ ہی نہیں سکتا، تو ایسے بکرے کی قربانی درست نہیں ہے اور اگر چوتھے پیر کو زمین پر رکھ کر لنگڑا کر چل سکتا ہو تو اس کی قربانی درست ہے۔(فتاویٰ قاسمیہ:22/435)

قربانی کے بجائے صدقہ دینا

سوال: آج کل بعض لوگ قربانی کے بجائے صدقہ دینے پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قربانی کے بجائے اتنی رقم صدقہ کر دینا کافی ہے، کیا ان کی یہ بات درست ہے؟

جواب: ایام قربانی میں جانور ذبح کرنا ہی لازم ہے، جانور کی قیمت صدقہ دینے سے واجب قربانی ذمہ میں باقی رہے گی اس لئے قیمت صدقہ کرنے سے کام نہیں چلے گا، اور جو شخص وسعت کے باوجود قربانی نہ دے تو وہ شخص سخت گنہگار ہوگا؛ کیوں کہ وہ واجب کا تارک ہے۔(کتاب المسائل ۲/ ۲۹۴)

قربانی کے ایام

سوال: قربانی کے ایام، صرف تین دن ہیں یا چار دن؟

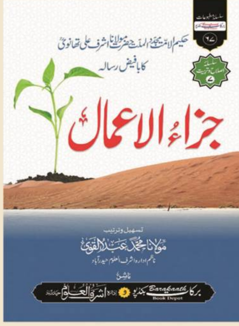
جواب: قربانی کے ایام صرف تین دن ۱۰، ۱۱ اور ۱۲ ذی الحجہ ہیں۔(کتاب المسائل، ۲/ ۲۹۴)

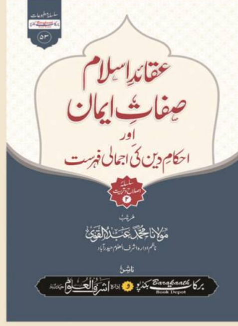
بزرگ سے ملاقات کے وقت اپنے ہاتھ چومنا

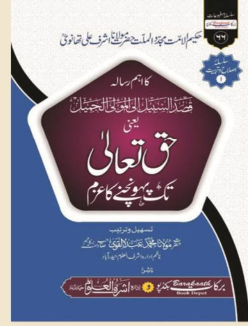
سوال: کسی بزرگ یا عالمِ دین سے ملاقات کرنے کے بعد خود اپنے ہاتھ کو چومنا جائز ہے یا نہیں؟

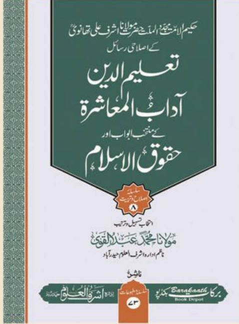
جواب: کسی بزرگ یا عالمِ دین سے ملاقات کے وقت اپنے ہاتھ کو چومنا مکروہِ تحریمی ہے، البتہ کسی بزرگ کے ہاتھ بہ قصدِ تبرک چوم لئے جائیں تو مضائقہ نہیں۔(فتاویٰ عثمانی، ۱/ ۲۴۹)

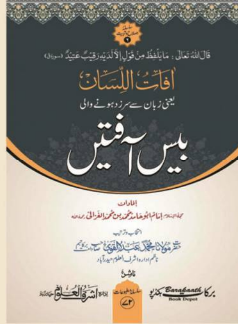
ASHRAFUL JARAID MONTHLY Rs20/-
RNI No: APURD/2007/24089 Postal. No: HSE/884/20-22
Date of Publication 3rd Jul-22, date of Posting 5th Jul-22

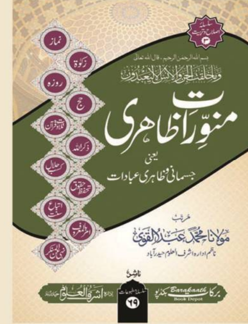


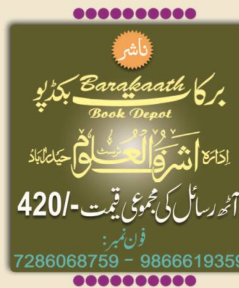


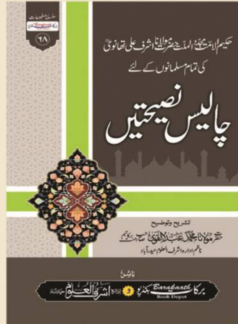


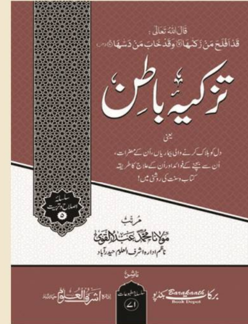












Printer, Publisher & Owner: Mohd Abdul Qavi, # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Published from: # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Editor : Mohammed Abdul Qavi. Printed at: Aish Offset Printers, Cellar Masjid-e-Meraj, Sayeedabad, Hyd-59